

ایجمید

پھول اُداس ہیں



خزاں کے زرد پھولو!

میری محبت کا چہرہ بھی تمہاری طرح ادا ہے

اس کے سینے میں بھی بہار کے داغ ہیں

اور خزاں کی ویرانی ہے

شام کے وقت اپنی زرد پلکیں

افق پر جمائے

تم کس کی راہ دیکھا کرتے ہو؟

طبع اول
اہتمام
سرورق
ناشر
مطبع
قیمت

2008ء
ملک مقبول احمد
الیس یعقوب
مقبول اکیڈمی
خورشید مقبول پریس
250 روپے

تیا ریاں

زگس کے ہاں آج پہاڑ پر جانے کی تیا ریاں ہو رہی تھیں۔

گھر میں کوئی بھی فرد ایسا نہ تھا جو اس سلسلے میں کسی نہ کسی کام میں مصروف نہ ہو۔ زگس کے تینوں چھوٹے بہن بھائی اپنی مزاحیہ کہانیوں کی کتابوں اور رنگین کارٹونوں کی کاپیاں بڑے چاؤ اور دلچسپی کے ساتھ الماریوں سے نکال کر فضائی فوج کے خوبصورت نیلے تھیلوں میں رکھ رہے تھے۔ زگس کی امی بڑے دیوان خانے میں اپنے سامنے ملازموں سے بستر بند ہوا رہی تھیں۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گئی۔ لیکن چہرے پر فارغ البالی اور معاشی خوش حالی کی وجہ سے وہ جھڑیاں نمودار نہ ہوئی تھیں جو اس عمر میں عام عورتوں کے چہرے پر بڑی نمایاں ہوتی ہیں۔ صرف کنپٹیوں پر بال کہیں کہیں پر سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ سفید رنگ کی سیدھے سادھے لباس میں ملبوس تھیں اور سر کا آدھا حصہ پیازی رنگ کے دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔

کوشی کی دوسری طرف زگس کے والد لان میں درختوں کی چھاؤں تلے آرم کرسی پر نیم دراز پرانے اخباروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آنکھوں پر مونے شیشے کی بڑی براؤن فریم والی عینک لگی تھی۔ درمیان سے سر گنجد تھا۔ کنارے کنارے تقریباً تمام بال سفید تھے۔ جسم بوجھل لیکن تھکا تھکا سا تھا۔ چہرے پر مسلسل غور و فکر کے باعث اداسی اور پختگی ساتھ ساتھ ہویدا تھیں۔ آنکھوں میں ایک

خاص قسم کی ذہانت آمیز چمک تھی جو ان لوگوں کا ورثہ ہے۔ جنہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی تحقیق میں بسر کیا ہو۔ میز پر قلم دوات، خط لکھنے کا پیڈ اور چند ایک خطوط پڑے تھے۔ ایک خط پر نیلی روشنائی سے خواجہ احمد علی دائیں لکھا تھا۔

خواجہ احمد علی..... نرگس کے والد کا نام تھا۔ ان کا خاندان لاہور میں صدیوں سے آباد تھا۔ خواجہ صاحب کے جد امجد کہیں تیرہویں صدی میں کشمیر سے ہجرت کرنے کے بعد پنجاب کے دارالخلافہ لاہور میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ خاندان اسی تاریخی شہر میں آباد چلا آتا تھا۔ شروع شروع میں اس خاندان کے افراد نے اپنا آبائی دھندا یعنی گرم کپڑے کی تجارت جاری رکھا، لیکن بعد میں خاندان کے ایک اعلیٰ رکن نے مغل دربار میں شاہی خزانچی کا قابل احترام عہدہ حاصل کر لیا اور یہ خاندان دیکھتے دیکھتے دن دو گنی رات چو گنی ترقی کرنے لگا۔

بہت جلد لاہور شہر کے اندرونی علاقے میں ایک شاندار حویلی تعمیر کر دی گئی جس کے محرابوں اور شیشیوں کی دیواروں پر آگرہ کے مشاق کاریگروں نے شبانہ روز کی انتھک محنت سے چچی کاری کی اور تیل بوٹے بنائے۔ اگرچہ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس حویلی کا نشان مٹا دیا ہے، پھر بھی شہر کے اندر اس خاص محلے میں اس کے آثار باقی ہیں جن کا سراغ صرف خواجہ احمد علی دائیں ہی لگا سکتے تھے۔ اس جگہ اب ایک جدید طرز کی عالی شان عمارت تعمیر کر دی گئی ہے جہاں کارپوریشن کا اسکول قائم ہے۔

خواجہ صاحب نے جب پرانے گھریلو کاغذات اور کرم خوردہ دستاویزوں کی مدد سے اس

جگہ کی نشان دہی کی تو انہوں نے ایک جگہ چھوٹے سے ٹیلے کو اپنے خرچ پر کھدوایا تھا۔ تین دن کی کھدائی کے بعد وہاں سے چند ایک ناک شاہی اینٹیں اور دو تین طغریں برآمد ہوئے جنہیں دیکھ کر خواجہ صاحب خوشی سے پھولے نہ سائے۔

”یہی جگہ ہے بالکل یہی جگہ.....“

انہوں نے بڑی بے تابی سے اینٹوں اور طغروں کو اٹھا کر غور سے دیکھا اور انہیں ساتھ لے کر اپنے شہر سے باہر والے مکان میں آ گئے۔ اپنی لائبریری میں بیٹھ کر انہوں نے پورا ایک ماہ ان طغروں پر تحقیق کا کام جاری رکھا اور بعد ازاں عینک میز پر رکھ کر ایک آہ بھری اور اپنے بڑے لڑکے سلمان سے کہا

”سلمان! وہ لوگ باقی نہیں ہیں مگر ان کے ہاتھوں کا لمس ان طغروں پر زندہ ہے۔ میں اس لمس کی ملائمت اور گرمی محسوس کر رہا ہوں۔ کاش! کسی طرح پورے اسکول کی کھدائی ہو سکتی۔“

”سلمان نے کہا“

”لیکن ابا جان! ایسا نہیں ہو سکتا۔ پورے اسکول کی کھدائی تو بڑے دور کی بات ہے صرف اس کا برآمدہ کھدوانے پر ہزاروں روپے اٹھ جائیں گے۔“

”اس پر خواجہ صاحب ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئے تھے۔“

ہمایوں شہنشاہ کے آخری ایام میں خواجہ صاحب کے اجداد نے حویلی بیچ دی تھی اور وہاں

سے نکل کر شہر کے شمال مغربی علاقے میں ایک نئے محلے میں آ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ خاندان اسی جگہ آباد رہا اور خواجہ صاحب کی پیدائش بھی اُسی مکان میں ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے دادا غدر سے بہت پہلے شاہی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور ان کا گزارہ جاگیروں پر تھا۔

غدر کے وقت یہ جاگیریں بد قسمتی سے ایک جھوٹی سازش کے الزام میں اُن سے چھین گئیں اور اس خاندان نے پھر وہی گرم کپڑے کا دھندا شروع کر دیا۔ یہ کام بھی کوئی معمولی نہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے پھر وہی خوش حالی اور فارغ البالی کا دور آ گیا۔ خواجہ صاحب کے والد نے اپنے کاروبار کو کافی وسیع کر دیا اور یورپ کے ممالک سے بھی تجارت شروع کر دی۔

انہوں نے خواجہ احمد علی کو تعلیم کے لیے بیرونی ممالک میں بھی بھیجا جہاں انہوں نے چھ سال بسر کیے۔

لاہور واپس آئے تو والد نے انہیں اپنے آبائی کام میں واپس بلانا چاہا مگر خواجہ صاحب باہر کی ہوا کھا آئے تھے اور روشن خیالی نے ان کے دل و دماغ میں ننھے ننھے ان گنت چراغ جلا دیے تھے۔ کاروبار میں ان کا بالکل جی نہ لگتا تھا۔ بچپن ہی سے ان کا مزاج عالمانہ تھا اور چھوٹی سے چھوٹی بات پر گھنٹوں سوچ بچار کیا کرتے تھے۔ غور و فکر ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ یورپ کے سفر اور وہاں کی عالی شان لائبریریوں اور کتب خانوں اور علمی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور خواجہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔

چنانچہ واپس لاہور پہنچ کر جب ان کے والد صاحب نے کاروبار کی باگ ڈور تھامی چاہی

تو خواجہ صاحب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شہر کے ایک مشہور سرکاری کالج میں پروفیسر بن گئے۔ سات سال تک بڑی کامیابی، محنت اور خوش اسلوبی سے پروفیسری کرنے کے بعد انہیں ایک دوسرے کالج کی جانب سے پرنسپل کے عہدے کی پیشکش کی گئی۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔

اس وقت سلمان یعنی خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے کی عمر ۲۰ سال تھی اور نرگس ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

والد کی وفات کے بعد احمد علی صاحب اپنے چچا اور چچا زاد بھائیوں کی شرکت کے ساتھ پھر کاروبار میں اُتر آئے۔ اس لیے کہ اخراجات زیادہ تھے اور تنخواہ قلیل تھی۔ بیگم نے بھی اس بات کو گوارا نہ کیا کہ کاروباری زندگی سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کنبہ شہر سے باہر خوبصورت باغوں اور درختوں والے علاقے میں آ گیا۔ یہاں آم اور یوکلپٹس کے درختوں کے درمیان ایک شاندار کوٹھی تعمیر کروائی گئی جس کی روشوں پر سنگ مرمر کی کرپیں پھیلائی گئیں اور جس کی بیرونی دیواروں پر عشق پیچاں اور پک اینڈ پک کی خوبصورت رنگین پھولوں والی بلیں چڑھائی گئیں۔

اسی مکان میں دو بھائیوں اور ایک بہن کے بعد نرگس نے جنم لیا۔ خواجہ صاحب نے اپنے بچوں کو اپنی ذہنی رفتار اور مزاج کے قدرتی رجحان کے مطابق خاطر خواہ تعلیم دلائی۔ سب سے بڑے لڑکے سلمان نے ایم اے کرنے کے بعد برمنگھم جا کر کپڑے کی صنعت کے سلسلے میں خاص فنی تعلیم حاصل کی اور واپس آ کر اپنے آبائی کام کو پوری طرح سنبھال لیا اس سے چھوٹے بھائی رحمان علی نے ولایت سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لاہور میں وکالت شروع کر دی۔ نرگس کی بڑی بہن سعیدہ نے بھی ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی شادی ایک کشمیری نژاد فوجی کپتان سے

ہوئی تھی جو فوج میں ڈاکٹر تھا۔ سعیدہ اپنے بچوں کے ساتھ جہلم میں رہتی تھی۔ سلمان کی شادی ہوئے دس سال ہو چکے تھے وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ایک الگ کوشی میں رہتا تھا۔ رحمان کی شادی کو دوسرا برس گزر رہا تھا۔ وہ اپنی نازک اندام خوبصورت بیوی کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہی قیام پذیر تھا اور ابھی اس کا الگ ہونے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ دراصل نرگس کے والد خواجہ احمد علی میں اور تو بے شمار خوبیاں تھیں مگر ایک بہت بڑا نقص بھی تھا۔ وہ یہ تھا کہ آپ ذرا کجس واقع ہوئے تھے۔

اپنے بچوں کی تعلیم پر تو ہزاروں خرچ کر سکتے تھے لیکن ویسے انھیں کبھی نہ پوچھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں خرچ کرتا دیکھ کر ٹوکا کرتے تھے کبھی کبھی خود باورچی خانے کا چکر لگایا کرتے اور اگر بچا ہوا گوشت، دال یا سالن دیکھ پاتے تو نوکروں پر برس پڑتے۔

”یہ اب تمہارا باپ کھائے گا؟ آخر اتنا پکایا کیوں گیا تھا؟ کون سے مہمان آئے ہوئے تھے؟“

ان کا مزاج بھی کسی حد تک گرم واقع ہوا تھا۔ خلاف مزاج بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اپنی کسی بات پراڑ جاتے تھے تو انھیں وہاں سے ہٹانا قائل کروانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ان کے بچوں میں سوائے بڑی لڑکی سعیدہ کے اور کوئی بھی ان کی طبیعت پر نہ گیا تھا۔ سعیدہ ان کی طرح تنگ مزاج تھی۔ دراصل خواجہ صاحب کی بیگم اور نرگس کی والدہ بڑی انمول اور زندہ دل شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ پرانے ڈھب کی کھلے دل کی خاتون تھیں جنھیں طرز جدید سے بغض فی سبیل اللہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ جدید کتب کا بعض پرانی کتب کے ساتھ ساتھ بڑے شوق سے مطالعہ کرتی تھیں۔ والد نے خرچ کے معاملے میں اولاد پر جس قدر پابندی عائد کر رکھی تھی والدہ نے انھیں اتنی

ہی آزادی دے رکھی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد جو کوئی جتنے پیسے چاہتا ان سے وصول کر لیتا تھا اور وہ انھیں سوائے اس کے اور کچھ نہ کہتی تھیں۔

”اپنے ابا کو نہ بتانا“

دراصل دل میں وہ بھی اپنے خاوند سے دینی تھیں یہ الگ بات ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور بہترین ذہنی نشوونما ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایسا کبھی موقع ہی نہ آنے دیا تھا کہ ان کی اسی کمزوری کا راز افشا ہو جائے۔

خواجہ احمد علی کی یہ کوشی شہر کے باہر ایک پُر فضا علاقے میں تھی۔ یہاں سے شہر کے خوبصورت ترین باغات، تفریح گاہیں، کلب اور پارک تھے۔ باغوں میں درختوں کے جھنڈ تھے جہاں برسات میں کونکوں کی جھنکاریں گونجا کرتی تھیں اور سردیوں کی شام کو گلاب کے بڑے بڑے نازک پھولوں پر سیاہ چشم بھونرے منڈ لایا کرتے تھے۔ بہار میں باغ کی فضا چپا، سرین گل صد برگ، موتیا، گلاب اور گل شبو کے پھولوں کی مہک اٹھتی اور چاندنی راتوں میں چمکیلے تارے رات گئے تک پھولوں سے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ دور سایہ دار روشوں کے اس پار پولکٹس کے درختوں میں گھرے ہوئے کلب گھروں میں دھیمی دھیمی خوشگوار روشنیاں جھلملانے لگتیں اور کبھی کبھی کسی نفرتی تہقہ کی میٹھی آواز بھی سنائی دے جاتی نرگس نے اس پر تکلف، خوش حال اور روحانی فضا میں آنکھ کھولی کوشی کے کھلے لان میں نرم گھاس پر لڑھک لڑھک کر چلنا سیکھا۔ کونکوں اور بلبلوں کی نغمہ پیرائی میں بولنا سیکھا اور آم کے درختوں تلے گلاب کے خوشبودار جھاڑیوں میں اپنی امی کے ساتھ بھاگنا دوڑنا سیکھا۔ بیش قیمت ایرانی قالینوں پر لیٹ کر بچپن کی لوریاں سنیں۔ گرم خواب گاہ

میں آشدان کے پاس اپنی گڑیوں اور کھلونوں کے درمیان بیٹھ کر امی جان سے پریوں اور شہزادیوں کی کہانیوں سنیں۔

ابتدائی تعلیم کنڈرگارٹن میں حاصل کی۔ پھر کانٹنٹ میں پڑھنا شروع کیا اور اس کے بعد شہر کے سب سے بہترین اور مشہور کالج کا زمانہ شروع ہو گیا جو آج بھی جاری تھا۔

”زگس نے علمی اور ادبی رجحان کا ورثہ اپنے باپ سے پایا تھا اور شگفتہ دلی کی انمول دولت اپنی والدہ سے حاصل کی تھی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی، لیکن اُسے بڑی شکل بھی نہیں ملی تھی۔ بیضوی چہرہ، گورارنگ، سڈول جسم، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لمبے لمبے سنہری بال اور ذرا موٹے ہونٹ“

علاوہ ازیں اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی دلکشی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بے زبان مگر شوخ قسم کا وقار ہر لحظہ نمایاں رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے نئے ملنے والے کو بڑی غلط فہمی ہوتی تھی۔ شروع شروع میں اسکی ہر نئی سہیلی نے اسے شریر اور چنچل طبیعت کی لڑکی سمجھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک دوسرا موڈ بھی ہے جو اُسی اور تنہائی کا موڈ ہے۔

یہ اُسی اور تنہائی زگس کی زندگی پر چاروں طرف سے چھائی ہوئی تھی۔ پہلے پہل اسے اس کا قطعی احساس نہ ہوا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اور وہ جوانی کی منزلوں میں داخل ہوتی گئی اسے اس تنہائی کا شدید احساس رہنے لگا۔ وہ اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھی۔ اُسے خود بھی علم نہ تھا کہ یہ موڈ کیسا ہے اور وہ کیوں کبھی کبھی ہنستے ہنستے باتیں کرتے کرتے ایک دم اُداس ہو جاتی ہے؟

یہ اُسی جہاز کے لنگر کی طرح ایک دم اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی تھی اور وہ ایک جگہ بالکل ساکن ہو کر رُک جاتی تھی۔ جب یہ موڈ گزر جاتا تو وہ محسوس کرتی کہ اس کے سینے کے اندر کوئی شے نامعلوم انداز میں سرگوشیوں میں کہہ رہی ہے یا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔

چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ زگس قدرتی طور پر تنہائی پسند ہو گئی تھی کالج میں یہ اس کا پانچواں سال تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئی تھی تو ایک بے فکر تلی کی طرح وہ ڈال ڈال پات پات خوشی سے گنگنائی ہوئی اڑا کرتی تھی۔ کالج کی ہر لڑکی اس کی سہیلی تھی۔ کالج کی ہر لڑکی سے اس کا گہرا دوستانہ تھا۔ چونکہ اس کا دل صاف اور روشن تھا اس لیے اسے کسی سہیلی کو راز دار بنانے کی ضرورت تھی۔ اسی وجہ سے ہر لڑکی اس کی سہیلی تھی اور ہر لڑکی اس سے پیار کرتی تھی۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہم لوگ غم زدہ دوستوں کی نسبت ہنس کھ اور زندہ دل لوگوں کی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ زگس بہت جلد سارے کالج میں مقبول ہو گئی۔

وہ کالج کی ہر تحریک، ہر کھیل، ہر سرگرمی میں پورا پورا حصہ لیتی مشہور کالج کے پرنسپل کی صاحبزادی ہونے کی وجہ سے پروفیسر زویسے بھی اس کی عزت کرتے۔ لیکن ہر بلند قہقہے کے بعد ایک طرح کی تھکن اور پڑمردگی لازمی ہوتی ہے۔ چنانچہ زگس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بی اے میں ایک سال گزارنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا اندر خالی برتن کی مانند ہے جسے اگر ذرا سا بجایا جائے تو وہ دیر تک بجتا رہتا ہے اسے پہلی بار اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا۔ اتنی سہیلیوں کے درمیان بھی تنہا ہونے کا شدید احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے ادب کا مطالعہ شروع کر دیا پوری سنجیدگی سے مطالعہ شروع کر دیا۔ مطالعے نے اسے ذہنی سکون ضرور دیا مگر اسے پہلے سے زیادہ تنہائی پسند بنا دیا۔ چنانچہ اب یہ حالت تھی کہ زگس کم گو اور کم آمیز لڑکی تھی۔ وہ شگفتہ مزاج ضرور تھی

ہنستی بھی تھی، لطیفے بھی بیان کرتی تھی۔ خوبصورت پھولوں پر اڑنے والی رنگ رنگ کی تیلیوں کو دیکھ کر خوش بھی ہوتی تھی۔ مگر بنیادی طور پر وہ اُداس تھی۔ اس کا دل غمگین تھا کسی ان جانے غم کو سینے سے لگائے ہوئے تھا کسی ان دیکھے شہر کے لٹ جانے کا ماتم کر رہا تھا اور کسی اجنبی جزیرے کے غرق ہو جانے کے دکھ میں نوحہ کناں تھا۔

پہاڑ پر سارے کا سارا کنبہ جا رہا تھا!

سلمان بھی پوری تیاری کر کے ساز و سامان اور بال بچوں کے ساتھ زرگس کے ہاں آچکا تھا۔ چنانچہ اس کے بچوں نے دالان میں شور مچا رکھا تھا رحمان اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ کئی روز سے تیار یوں میں مصروف تھا۔ سعیدہ کو جہلم لکھ دیا گیا تھا کہ وہ تیار رہے اُسے بھی ساتھ لے لیا جائیگا۔ سعیدہ نے جواب بھی دے دیا تھا کہ اس کا خاوند تو نہ جاسکے گا مگر وہ اسٹیشن پر تیار ملے گی۔ کوہ مری میں ملازم بھجوا کر ایک شاندار کوٹھی پورے سیزن کے لیے کرایہ پر لے لی گئی تھی۔

پر وگرام یہ تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد لاہور سے بذریعہ ریل راولپنڈی کی طرف کوچ بول دیا جائے۔ جہلم سے سعیدہ کو ساتھ لے لیا جائے (سعیدہ کی بھی نشست مخصوص کر والی گئی تھی) رات راولپنڈی میں بسر کی جائے اور دوسرے روز صبح تازہ دم ہو کر پہاڑ کا سفر شروع کیا جائے۔

ریل کے سفر کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ خواجہ صاحب کو بس کا سفر نا پسند تھا۔ ویسے بھی بس کے مقابلہ میں ریل کا دوسرا درجہ ہزار درجے بہتر تھا۔ چنانچہ اس وقت دائیں لاج میں زبردست

تیاریاں ہو رہی تھیں اور اچھی خاصی رونق لگ رہی تھی۔ سلمان اور رحمان ضروری خرید و فروخت کے سلسلے میں اپنی اپنی بیگموں کے ساتھ انارکلی گئے ہوئے تھے۔ زرگس کے والد صاحب عقی لان میں بیٹھے بڑے اطمینان سے تازہ ڈاک دیکھ چکنے کے بعد اخبارات کی پرانی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ امی جان بڑے ڈرائنگ روم میں ملازموں سے اپنے سامنے ضروری سامان بندھوا رہی تھیں۔ بچے اپنے چھوٹے چھوٹے نیلے تھیلوں میں کہانیوں کی کتابیں اور کارٹونوں کی رنگین کاریاں جوڑ رہے تھے۔

”زرگس بھی اپنی چیزوں کے رکھ رکھاؤ میں مشغول تھی۔“

اس کا کمرہ کوٹھی کے مشرقی حصے میں تھا جس کی کھڑکی گلاب کی خوشبودار جھاڑیوں اور ولایتی مٹروں کی کیاریوں میں کھلتی تھی۔ ان کیاریوں کے عقب میں ایک دیوار تھی جس پر عشق بیچاں کی تیل نے ساری انیٹوں کو چھپا رکھا تھا دیوار کی پرلی طرف ساتھ والی کوٹھی کی دوسری منزل کی کھڑکیاں آسمان کے درختوں کے تنوں میں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ زرگس کے کمرے کی کھڑکی پر انگور کی تیل نے سایہ کر رکھا تھا۔ اس تیل میں ایک گلدم نے اپنا گھونسلہ بنا دیا تھا جہاں بیٹھ کر وہ صبح اور شام دونوں وقت اپنے بچوں کو دانہ کھلایا کرتی تھی۔ زرگس کا کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر آرائشی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف پٹنگ بچھا تھا جس پر سفید پھولدار چادر بچھی تھی۔ کونے میں کپڑے رکھنے کی بڑی سی الماری پڑی تھی جس کے آدھے پٹ پر آئینہ لگا ہوا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی جالی دار پاؤں والی چھوٹی سی میز لگی تھی جس پر رکھے ہوئے کانسی کے لمبو ترے گلدان میں گلاب کے پھول تھے جو ذرا مر جھا رہے تھے اور اپنے مالک کی بے اعتنائی کی شکایت کر رہے تھے۔

لکھنے والی میز پر کئی ایک کتابیں ایک دوسری کے اوپر پڑی تھیں۔ شیشے کی دوات پر پلاسٹک کی سیاہ جڑیا پر کھولے اڑنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

آتش دان کے قریب رکھا ہوا سیاہ شیلف گرد آلود کتابوں اور رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیلف کے اوپر ایک طرف چاء دانی پڑی تھی اور دوسری طرف رسالہ فلم فیئر کا تازہ شمارہ رکھا تھا۔ کارنس کے دونوں کونوں پر چینی طرز کی پرانی پھولدار صراحیاں سج رہی تھیں۔ درمیان میں یونان کی ایک نیم برہنہ عورت کا ایک چھوٹا سا بت پڑا تھا جس کا ایک کان ٹوٹا ہوا تھا۔

سنگھار میز پر قسم قسم کی کریمیں اور پاؤڈر رکھے تھے اور ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ایک جدید خوش حال گھرانے کی کالجیٹ لڑکی کو ضرورت ہوتی ہے۔ کارنس کے اوپر سنہری فریم میں قائد اعظم کی سہ رنگی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اسی تصویر کے نیچے زرگس چڑے کا بڑا صندوق کھولے اس میں اپنے گرم کپڑے، سویٹر، اونی شالیں، کوٹ اور ضرورت کی دوسری چیزیں بند کر رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ پلنگ کی پٹی پر لٹک رہا تھا اور سنہری بال بے خیالی سے سرخ رومال سے بندھے ہوئے تھے بڑی بڑی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمیر دھیمے دھیمے سلگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صبح جلدی اٹھ بیٹھی ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ آج زرگس کو جلدی جاگنا پڑا تھا۔ سب سے زیادہ اُسے پہاڑ پر جانے کی خوشی تھی چنانچہ اس خوشی میں وہ منہ اندھیرے ہی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے بڑے کام کرنے ہوں گے، لیکن معلوم ہوا کہ کوئی خاص کام نہ تھا۔ گرم کپڑے وٹھل دھلا کر شام ہی سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ ناشتہ ملازم پکا رہے تھے۔ کھانا ابھی انھیں ہی تیار کرنا تھا بستر وں کی پہلی کھپ بڑے بھائی جان بندھوا رہے تھے۔

چنانچہ وہ پنکھا چھوڑ کر برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹ گئی اور وہیں سو گئی آدھ گھنٹے بعد اس کی امی جان نے اسے جگایا۔

”اری زرگس! اگر یہاں سونا تھا تو بستر سے کیوں اٹھیں؟“

زرگس آنکھیں ملنے لگی۔

”کچھ نہیں امی! یونہی آنکھ لگ گئی“

”تو باغ میں جا کر سو رہتا؟“

”مگر امی! کام بھی تو ہزاروں پڑے ہیں؟“

اس کی امی ہنسنے لگیں

”اری بھلا کونسے کام ہیں؟ مجھے بھی تو بتاؤ“

اب زرگس نے محسوس کیا کہ واقعی ایک بھی کام نہیں۔ بس ایک ہی تو کام تھا یعنی اٹھ کر نہایا جائے، چاء پی جائے، ناشتہ کیا جائے، اور صندوق میں ضروری کپڑے بند کیئے جائیں۔ مگر اس میں تو ابھی سات گھنٹے پڑے تھے پھر اتنی جلدی اٹھنے کا کیا فائدہ؟ مگر اب کیا کیا جاتا؟ وہ اٹھ بیٹھی تھی اور پھر سونا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ امی جان مسکرانے لگیں۔

”دیوانی کہیں گی“

زرگس نے امی کی بات سن لی تھی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے چھت کا پنکھا پوری رفتار پر چھوڑا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا سچ مچ وہ دیوانی ہے؟ وہ ہنس پڑی۔ دیوانی ہی تو ہوں ورنہ بھلا کوئی اتنا بے چین بھی ہوتا ہے! اس کے بعد پلنگ سے اٹھی اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

باغ کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ انگوڑے کے پتوں پر شبنم کی بوندیں ٹٹمارہی تھیں اور ہوا میں ان کی تازہ مہک اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ اسے زندگی، صحت اور روشنی کا گہرا احساس ہوا۔ صبح ہو چکی تھی اور آسمان کے درختوں کے عقب میں سورج نے اپنی روشنی کا علم بلند کر دیا تھا۔ فضا آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ نرگس کو خیال آیا کہ لاہور میں کس قدر گرمی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ گرمیوں کے باقی پتے ہوئے دن لاہور کی جھلکتی ہوئی سڑکوں سے دور مری کی شاداب پہاڑیوں پر بسر کرے گی۔

اس کے چہرے پر مسرت کی چمک سی پیدا ہوئی اور اس کی نگاہیں اپنے آپ آسمان کے درختوں میں سے گزر کر ساتھ والی کوٹھی کی دوسری منزل والی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں اس کوٹھی کے پہلے مکین اٹھ گئے تھے اور اب نئے کرایہ دار آئے تھے۔ انھیں یہاں آئے چند ہی روز ہوئے تھے۔ یہی کوئی دو تین ماہ!

کچھ عرصے سے ایک خاموش صورت لڑکا روزانہ کسی نہ کسی وقت اس کھڑکی میں آ کر نرگس کو دیکھا کرتا تھا۔ پہلے پہل تو نرگس کو گمان بھی نہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یونہی اس کھڑکی میں آ گیا ہے اور اس کی نظر اس پر پڑ گئی اور ابھی واپس چلا جائے گا۔

لیکن جب وہ ہر روز دن میں دو ایک بار اس کھڑکی میں آنے لگا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے ٹائی لگانا اور بال بنانا اور کبھی کبھی یونہی کھڑے ہو کر سگریٹ پینا شروع کر دیا تو نرگس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ لڑکا اس کے لیے وہاں کھڑا ہوتا ہے اب اس نے بھی اس ڈرامے میں

دلچسپی لینا شروع کر دی۔ دور سے وہ اس نوجوان کے خدو خال کا اچھی طرح اندازہ نہ کر سکتی تھی۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا رنگ گندمی ہے۔ چہرہ گول ہے اور بال گھونگر یا لے ہیں۔

نرگس سنجیدہ نہ تھی یونہی دل لگی کے خیال سے وہ اس کھیل کو جاری رکھا چاہتی تھی۔ چنانچہ اب اس نے قصہ کھڑکی میں کھڑے ہونا شروع کر دیا۔ اس لڑکے کو اس سے مزید تقویت ملی اب وہ زیادہ دیر تک کھڑکی میں کھڑا رہتا۔ وہ اور تو کچھ نہ کرتا، نہ اشارہ کرتا، نہ زبان سے کوئی لفظ بولتا، بس خاموش کھڑا چپ چاپ نگاہوں سے نرگس کو تکتا رہتا۔ نرگس کو اس کھیل میں بڑا مزہ آنے لگا۔ اس کی اداسی کو ایک شغل ہاتھ لگ گیا اور کسی حد تک اس کا جی بہلتا تھا اور اس کی تنہائیوں کا خوف ناک سکوت ٹوٹ گیا۔ لیکن بد قسمتی سے نرگس نے ایک دن اسے دیکھ لیا۔

”قریب سے دیکھ لیا“

وہ کالج جانے کے لیے اپنی کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی کہ وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ ہی گول چہرہ، گندمی رنگ، گھنگھریا لے بال اور، سرخ ٹائی جو اس نے اس کے سامنے کھڑکی میں کھڑے ہو کر باندھی تھی اور پھر وہ نرگس کو دیکھ کر ذرا سا مسکرایا بھی! نرگس کا جی بیٹھ گیا۔

اس لیے کہ وہ بد صورت تھا اس کی ناک جھٹی تھی، چہرے پر چچک کے بے شمار داغ تھے اور لنگڑا کا چلتا تھا۔ نرگس نے ناک سکوڑ لی اور ڈرائیو کو جلدی جلدی کا رچلانے کو کہہ کر کتاب پڑھنے لگی۔ اس روز کے بعد سے نرگس نے اس لڑکے میں مزید دلچسپی یعنی چھوڑ دی۔ ہاں کبھی کبھی یونہی وضعداری کو نبھانے کے خیال سے اس کی طرف دیکھ لیا کرتی اور بس اس سے زیادہ

طرف سے پہلا محبت نامہ ہوگا کیا لکھا ہے؟ اس نے کمرے میں آکر اسے کھولا بڑے بھونڈے خط میں پنسل سے یہ چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”محترماً!

کیا آپ کو میرا کھڑکی میں سے اس طرح تکتے رہنا برا تو محسوس نہیں ہوتا؟ میں اس گستاخی کا ارتکاب کبھی نہ کرتا۔ اگر زمام عقل جنون عشق کے بجائے میرے اپنے ہاتھوں میں ہوتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں یہ کاغذ کا پرزہ نہیں، میرے دل کا ٹکڑا ہے جو آپ کے قدموں میں گرا ہے۔

فقط آپ کا غلام۔۔۔۔۔

نیچے نام بالکل نہیں لکھا تھا۔

زگس نے فوراً یہ نتیجہ نکالا کہ حال ہی میں منشی فاضل کا امتحان دیکر آیا ہے اور فلم دیکھنے کا بڑا شوقین ہے خط پڑھ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔ اور اسی طرح ہنستے ہنستے وہ کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے وہ صاحب بدستور کھڑے تھے اور بڑی معنی خیز نگاہوں سے اسے تنک رہے تھے۔ زگس ہنستی گئی اور اسی طرح وہاں سے بھاگ کر دوسری طرف چلی گئی۔

صندوق میں کپڑے رکھتے ہوئے نرگس یکا یک ہنسنے لگی۔ دراصل ایک پرانے گرم کوٹ

مگر وہ لڑکا برابر اپنے وقت پر کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو جاتا اور سگریٹ سلگا کر نرگس کی کھڑکی کی جانب دیکھنا شروع کر دیتا۔ جیسے خیال ہی خیال میں نرگس کے کمرے میں پہنچ کر اس کے پاس قالین پر بیٹھا اظہار محبت کر رہا ہو ایک دن کیا ہوا کہ نرگس دوپہر کے وقت اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی کالج کا سبق پڑھ رہی تھی موسم ذرا اچھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بھورے رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ یہ موسم برسات کے پہلے بادل تھے۔ اس لیے بڑے خوشگوار اور بھلے لگ رہے تھے۔ نرگس نے کھڑکی کھول دی اور وہیں بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگی۔

ابھی اُسے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سامنے ولی دیوار کے اوپر اسی
لنگڑے لڑکے کا سر نمودار ہوا۔ زگس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ یا اللہ! اب کیا ہوگا؟
اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی دیوار پھاند کر اس کے پاس آ کر دوڑا نو ہو جائے گا اور محبت کا اظہار شروع کر
دے گا اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے باپ کے غمے کا خیال آیا اور وہ تھر تھر کا پٹنے لگی۔

لیکن خیریت ہی گزری اس لڑکے نے بایاں ہاتھ اور پراٹھا کر گول سا کاغذ باغ میں پھینکا اور پھر جلدی سے دوسری طرف غائب ہو گیا پہلے تو زنگس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ پھر وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور ادھر ادھر سے ملازم کی آنکھ بچا کر باغ میں گئی اور وہ رقعہ جلدی سے اٹھا لائی وہ کسی محبت یا اسی قسم کے کسی دوسرے پر اسرار جذبے کے تحت اٹھ کر وہاں نہ گئی تھی بلکہ وہ محض یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس بد صورت لڑکے نے اس خط میں جو یقیناً اس کی

کی جیب میں سے وہی رقعہ نکل کر نیچے گر پڑا تھا اس نے وہ رقعہ اٹھا کر یونہی بغیر کسی خاص مطلب کے اپنی بڑی الماری کے سب سے نچلے خانے کے کونے میں رکھ کر اسے قفل لگا دیا اور پھر آن کر صندوق میں اپنے کپڑے رکھنے لگی اس کے عقب میں سامنے والی کھڑکی میں ایک لڑکا کھڑا تھا۔

خاموش صورت لڑکا

وادی کوہ مری

کھانے کے بعد یہ قافلہ دائیں لاج سے شیش کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہلم تک سفر خاصا دلچسپ رہا پورا ڈبہ محفوظ کر دیا گیا تھا۔ یہ ڈبہ کافی بڑا تھا اور اس میں پورا کنبہ سفر کر رہا تھا۔ خواجہ احمد علی نے مصلحتاً اپنی نشست ساتھ والے ڈبے میں ریزرو کروائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اب تو وہ بچوں میں بیٹھ کر خواہ مخواہ ان کا منہ بند کر دیں گے اور ان کے سفر کا مزا کر کر اہو جائے گا۔ دوسرے وہ خود آرام نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اس بڑے ڈبے میں سلمان، رحمان اور ان کی بیوی بچے، نرگس کی والدہ، نرگس، اس کے چھوٹے بہن بھائی اور ایک رحیم خادمہ! امی جان نے ساتھ بہت کچھ تیار کر دیا تھا۔ کوفتے، پرائٹے، آلودوں والی روٹیاں، روغنی روٹیاں، مرغ، قیمہ، حلوہ اور پھلوں سے بھرے ہوئے دو ٹوکریے، برف کا ایک پورا بلاک اور پانی سے بھری ہوئی تین صراحیاں! علاوہ ازیں سلمان اور رحمان کا کنبہ بھی کافی کچھ پکا کر ساتھ لے چلا تھا۔

اگرچہ دوپہر کو گھر سے کھانا کھا کر چلے تھے مگر بچوں کی نظر میں ہر چیز تھی چنانچہ گوجرانوالہ گزرتے ہی بچوں نے بھوک کا نعرہ بلند کر دیا۔ پھر کیا تھا ڈبے میں سب کو بھوک لگ گئی، خاصدا ان کھل گئے برف توڑی جانے لگی، صراحیاں اٹھ لی جانے لگیں۔ پھل چھلنے لگے، خربوزے کٹنے لگے اور جہلم تک آدمے سے زیادہ کھانے کا صفایا ہو گیا۔

جہلم شیش ابھی دور تھا۔ یعنی گاڑی دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی کہ سارے کنبے نے

کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال لیے بچوں نے جب اپنے آپ کو ڈبے میں تنہا پایا تو وہ بھی عورتوں اور مردوں کی ٹانگوں میں گھسنے لگے۔ دریا گزر گیا جہلم آ گیا اور پھر سب نے دیکھا کہ سعیدہ شاندار ہلکے پھلکے ریشمی لباس میں ملبوس خوب میک اپ کیے اپنے پکتان خاوند کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ سب نے ہاتھ ہلائے اور شور مچا دیا۔

”بابی جان آداب، بابی جان آداب“

گاڑی رک گئی تو سلمان اور رحمان نے لپک کر سعیدہ کے خاوند پکتان بہرام خان سے ہاتھ ملایا سعیدہ کو پیار کیا اور اپنے والد صاحب کے ڈبے کی طرف چل دیے۔

خواجہ صاحب بھی شب خوابی کا لمبا چغہ پہنے اپنے ڈبے کے باہر کھڑے تھے۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے سب سے ہاتھ ملایا۔ سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر یہ لوگ ساتھ والے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ وہاں شور مچا گیا جس میں ہر طرف سے سعیدہ کی خیریت دریافت کی جا رہی تھی اور وہ باری باری ہر ایک کو جواب دے رہی تھی۔ نرگس اپنی بہن سے لپٹ گئی۔

”آپ نے تو ہمیں بالکل ہی بھلا دیا“ نرگس نے گلہ مند لہجے میں کہا۔
سعیدہ ہنسنے لگی۔

”اری گویا تمہارے بھائی جان کی نوکری ہی ایسی ہے چھٹی ہی نہیں ملتی“

اس دوران میں سلمان اور پکتان بہرام خان نے قلیوں کی مدد سے ڈبے کا ایک حصے میں اپنی بیگم کے سامان کا انبار لگا دیا تھا۔ امیر لوگوں کا ویسے ہی ساز و سامان بہت ہوتا ہے اور پھر جب

انھیں اس کی نمائش کا موقع ملے تو وہ اپنا سب کچھ گھر سے باہر لے آتے ہیں۔ سعیدہ نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ وہ آئس کریم بنانے والی مشین بھی ساتھ ہی لے آئی تھی کوئی اس سے پوچھے کہ بھی پہاڑوں پر آئس کریم والی مشین کا کیا کام! مگر انھیں اس سے کیا؟
مطلب تو سامان کی نمائش سے ہے!

گاڑی نے سیٹی دی! انجن نے وسل دیا، گاڑی نے جھنڈی ہلائی اور ریل جہلم کا پلیٹ فارم پیچھے چھوڑتی ہوئی پنڈی کی طرف چل پڑی۔ نرگس نے یونہی ذرا پلیٹ فارم کی چہل پہل دیکھنے کی غرض سے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ ریل گاڑی آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی اور پلیٹ فارم پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ ان کے ڈبے سے آگے ڈبہ چھوڑ کر تیسرے ڈبے میں ایک نوجوان جس کے گلے میں زرد رنگ کا سکارف لٹک رہا تھا، باہر تک رہا تھا، لیکن بہت جلد نرگس نے محسوس کر لیا کہ وہ لڑکا صرف اُسے تک رہا ہے، نرگس بالکل نہ گھبرائی، کیونکہ ایک اس کی پرورش بڑی کھلی اور صاف فضا میں ہوئی تھی دوسرے وہ بچپن ہی سے بے پردہ رہی تھی اور اسے اس بات کا نجوبی علم تھا کہ یہاں نوجوان لڑکی کو دیکھنا اور پھر دیکھتے چلے جانا اپنا قومی فرض سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے باہر کا تماشا کرتی رہی، مگر کتنی ہی آزاد فضا میں پرورش کیوں نہ پائی ہوتی پھر بھی وہ ایک ہندوستانی یا دوسرے لفظوں میں پاکستانی عورت تھی۔ بلکہ ابھی لڑکی ہی تھی۔ لہذا اس کا شرما جانا اور اس کے دل کا دھک دھک کرنا لازمی تھا۔ نرگس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونے لگا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر اندر کر لیا، لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنا سر اندر کر رہی تھی اس نے آخری بار اس لڑکے کی طرف دیکھا اس کے دیکھتے ہی اجنبی لڑکے نے نرگس کو ہاتھ ماتھے پر لے

اُسے سوچھی کیا؟ اس نے اتنی بے حیائی کا ثبوت کیوں دیا؟ جب وہ اس کی واقف ہی نہیں تھی تو پھر اُس نے اُسے سلام کیسے کر دیا؟ نرگس کا ذہن یہی معے حل کر رہا تھا اور وہ لڑکا جس کی عمر ۲۸، ۲۹ سال کے لگ بھگ تھی بک شال کے پاس کھڑا سگریٹ کا دھواں اڑاتا اسے مسلسل تکے جا رہا تھا اور ساتھ زیر لب مسکرا بھی رہا تھا۔ نرگس اس کی طرف کبھی کبھی اپنی طرف سے بے خیالی میں تک لیتی تھی، لیکن وہ اپنے چہرے اور لباس کی بھرپور نمائش کر رہی تھی۔ وہ باجی سے باتیں کرتے ہوئے خواہ مخواہ ہنس رہی تھی اور پھر ہنستے ہنستے یونہی باہر جھانک کر دیکھ لیتی تھی۔ اس دوران میں اسے یہ بھی خیال گزر رہا تھا کہ کہیں وہ دیوانی تو نہیں ہو گئی۔ مگر وہ مجبور تھی اُسے وہ لڑکا اور اس کی حرکت ہزار بڑی ہونے کے باوجود اچھی لگی تھی۔

انجن نے زور سے سیٹی دی۔

نرگس نے اس لڑکے کی طرف دیکھا اس نے بھی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ نرگس کو دیکھا اور لپک کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دور تک وہ ڈبے کے دروازے میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے دروازہ بند کر دیا اور ادھر نرگس نے بھی اپنا چہرہ اندر کر لیا۔

جب راولپنڈی آیا تو شام ہو چکی تھی۔

وہاں نرگس کے چچا اور چچا زاد بھائی اور بہنیں کثیر تعداد میں اپنے پورے سامان اور لاؤ لشکر سمیت ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ وہاں ایک بار پھر ایک شور مچ گیا جس میں

کوئی کسی کی نہ سنتا تھا اور ہر کوئی اپنی کہے جاتا تھا۔ وہاں اس قدر ہنگامے میں نرگس کو نہ تو کوئی خیال ہی آیا اور نہ اتنی فرصت ہی مل سکی کہ وہ اس نوجوان کو دیکھ سکتی۔

جب یہ لوگ تین چار کاروں میں بیٹھ کر مشکاف روڈ والی کوٹھی کی طرف چل پڑے تو نرگس کو اچانک اس لڑکے کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ کیا خبر وہ یہاں اترا ہی نہ ہو۔ اُسے پشاور جانا ہو۔ اس خیال سے نرگس کچھ اداس سی ہو گئی۔ پھر سوچنے لگی شاید وہ یہیں اتر پڑا ہو اور اگر یہیں اتر اہو تو پھر اس سے دوبارہ ملاقات کہاں ہوگی؟ اس جھوم میں وہ بھی گم ہو گیا۔ اب کون جانے کب ملاقات ہو؟

میلوں اور پلیٹ فارموں پر اسی طرح ملاقات ہوتی ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے انسان بچھڑ جاتا ہے اور پھر عمر بھر وہ صورت دوبارہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ نرگس ایک دم چپ ہو گئی اور اس پر وہی اُداس اُداس موڈ طاری ہو گیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے یہ موڈ زیادہ شدید ہو گیا۔ اب وہ اس خاص لڑکے کے لیے اُداس نہ تھی بلکہ اپنے لیے اُداس تھی۔ زندگی کی ان غیر فانی خوشیوں کے لیے اُداس تھی جو بہت کم فانی انسان کے حصے میں آتی ہیں۔

اپنی چچا زاد بہن نیلم سے اس کا بڑا پیار اور بے تکلفی تھی۔ اُس نے گھر پہنچتے ہی نیلم سے سینما جانے کا پروگرام پیش کر دیا۔

”نیلم بولی“

”مگر کو تو سفر کی تنگی ماندی ہے۔ تجھے تو آرام کرنا چاہیے“

”نرگس نے کہا“

”آرام کہاں نیلی! سینما ضرور چلیں گے“

”مگر گھر والوں کو کیا کہا جائے؟“

زنگس سوچنے لگی پھر بولی

”کوئی بہانہ بنا دیں گے“

”کونسا بہانہ؟“

”اب دونوں سوچنے لگیں۔ نیلم جلدی سے بولی“

”کہہ دیں گے تجھے تازی آپا سے ملانے لے گئی تھی۔“

زنگس اچھل پڑی۔

”بس ٹھیک ہے۔ پکچر کب شروع ہوتی ہے؟“

”بس کوئی سواچھ بجے“

”اب کیا وقت ہوگا“

”ارے چھ تو بج گئے“

”تو پھر بھاگو نیلی! بھاگو“

”پلازا“

دونوں کوٹھی کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر بڑی امی جان سے بہانہ بنا کر باہر نکلیں اور کار میں بیٹھ کر فوراً ہی پلازا سینما پہنچ گئیں۔ پکچر شروع ہونے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی تھے۔

انہوں نے سب سے پہلے لاؤنچ میں جا کر سکولیش پئے اور بعد ازاں آئس کریم کھائی، جس سے زنگس کے دل و دماغ کو کچھ ٹھنڈک پہنچی۔ اتفاق سے فلم بھی رنگین تھی اور لڑائی مار کٹائی اور تفریح سے بھرپور تھی۔ زنگس نے بڑی دلچسپی سے اُسے دیکھا۔

اور جب وہ سینما ہال سے باہر نکلی تو اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا اور خوش و خرم محسوس کر رہی تھی۔ باہر نکل کر انہوں نے سینما کے لان میں درختوں کے پاس تھوڑی چھل قدمی کی لاہور کی دلچسپیوں کی اور انارکلی کی چھل پہل کی باتیں کیں اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر دونوں آگئیں چونکہ فلم انگریزی تھی اس لیے جلد ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ کسی کو شک نہ ہوا کہ وہ کسی دوسری جگہ گئی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد زنگس پلنگ پر گرتے ہی سو گئی۔ سارے رستے کی تھکی ہوئی تھی بے سدھ ہو کر سوئی اور جب اٹھی تو دن چڑھ آیا تھا۔

سب لوگ اٹھ بیٹھے تھے اور بسوں کے اڈے پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ زنگس نے بھی اٹھ کر غسل کیا۔ تھوڑا سا میک اپ کیا۔ لباس تبدیل کیا اس دوران میں میز پر ناشتہ لگ چکا تھا۔ سارے خاندان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا ضروری سامان پیک اپ کیا اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر بسوں کے اڈے کی طرف چل پڑے۔

جس بس میں خواجہ صاحب اور ان کا پورا کنبہ براجمان تھا وہ کافی کشادہ بس تھی۔ پورے سوا دس بجے وہ راولپنڈی سے کوہ مری کی طرف روانہ ہو پڑی۔ شہر کے تنگ اور پر شور بازاروں میں سے تو وہ عام رفتار سے گزرتی گئی لیکن شہر سے باہر نکلتے ہی جب وہ کھلی سڑک پر پہنچی تو اچھی خاصی

رفتار پکڑ لی۔ نرگس فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور سفر کا پورا لطف اٹھا رہی تھی۔ وہ نیلم سے وعدہ لے کر آئی تھی کہ چند روز کے لیے وہ مری ان سے ملنے ضرور آئے گی اور نیلم نے باقاعدہ وعدہ بھی کر لیا تھا۔ نرگس اور نیلم کے درمیان بچپن ہی سے بڑی دوستی تھی ان دونوں کا بچپن قریباً ایک ہی جگہ یعنی لاہور میں ہی گزرا تھا۔ ان دنوں نیلم اپنے چچا کے ہاں لاہور ہی میں پڑھا کرتی تھی۔ نرگس کے چچا کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی لاہور سے اعلیٰ تعلیمی ماحول میں پروان چڑھے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ نیلم نے بی اے تک لاہور میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ اگرچہ وہ نرگس سے چار سال بڑی تھی مگر جب وہ دونوں ایک جگہ بیٹھی ہوں تو بالکل ہم عمر معلوم ہوتی تھیں۔

”بس پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔“

اب راولپنڈی کا میدانی علاقہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا اور اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود گرمی کی شدت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ اسی طرح پڑی رہی تھی۔ لو بھی ویسے ہی چل رہی تھی اور چہرے جھلے جا رہے تھے۔ پھر بھی اس کی وہ شدت نہ تھی جو لاہور کا خاصا ہے۔ نرگس کا خیال خود بخود نیلی آنکھوں والے اُس لڑکے کی طرف پلٹ آیا، جس نے اسے ریل میں سلام کیا تھا اور جو اس کے بعد پھر کہیں بھی نظر نہ آیا تھا۔ خدا جانے وہ راولپنڈی میں اتر ابھی تھا یا نہیں اور اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو یہ کیوں کر ضروری ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں نرگس سے ضرور ملاقات کرتا۔ راولپنڈی اتنا بڑا شہر ہے یہاں لوگوں کے ہجوم میں دو نیلی آنکھوں کو بھلا کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے اور اگر ایک لمحے کے لیے ان آنکھوں کا سراغ مل بھی جائے تو اتنے بڑے ہجوم میں ان کا پھر غائب ہو جانا یقینی تھا۔ نرگس نے اس کا ذکر نیلم سے قصداً نہ کیا تھا۔ وہ اسے یہ سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی اور سینما کے لان میں گزشتہ رات ٹہلتے ہوئے اس کا ارادہ ہوا بھی تھا کہ وہ نیلم کو الف سے بے

تک پوری حکایت سنا دے مگر پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اُس نے اس خاص راز میں نیلم کو اپنا حصہ دار بنانا گوارا نہ کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنی کوئی بات نیلم سے نہ چھپایا کرتی تھی۔ ہر بات نیلم کو لکھ دیا کرتی تھی اور اس سے مشورہ بھی طلب کیا کرتی تھی۔ یہ کوئی ایسی خاص باتیں نہ ہوتی تھیں بس گھر میں کسی سے جھگڑا، اسکول میں کسی سہیلی سے لڑائی کا معاملہ وغیرہ وغیرہ! مگر اس نیلی آنکھوں والے راز نے نرگس کو پراسرار بنا دیا تھا اور وہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ پہلے پہل تو اس راز کو اس نے اپنے آپ سے بھی چھپائے رکھا تھا۔ کتنی ہی دیر تک اس نے نیلی آنکھوں کے راز کو تسلیم ہی نہ کیا تھا۔ حالانکہ ان آنکھوں کا پہلا وار ہی نرگس کے دل پر اپنا کام کر گیا تھا۔

”بس چھتر کے مقام پر رک گئی۔“

”امی جان بولیں“

”رحمان! یہاں سے پانی بھر والینا بیٹا“

خواجہ صاحب نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے فرمایا

”اور لوکاٹ بھی خرید لو بھئی۔ یہاں کی لوکاٹ بڑی مشہور ہے“

”نرگس کی چھوٹی بھابی نے پیچھے سے نرگس پر جھک کر پوچھا“

”نگو! تو کیوں خاموش ہے ری؟ کیا گھریا د آرہا ہے؟“

”بھی کمزور جو ہوں“

دراصل سردی چھوٹی بھابی کو بھی محسوس ہو رہی تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کا سویٹر اور گرم کوٹ وغیرہ اوپر چھت پر بڑے صندوق میں بند تھے۔

خواجہ صاحب نے عینک کے موٹے شیشے اٹھا کر دور دیکھا

”معلوم ہوتا ہے بارش ہو رہی ہے“

”رحمان نے بھی اوپر نگاہ دوڑائی“

”شاید“

لیکن جب لاری سنی بینک یعنی کوہ مری کی دہلیز پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ مری کو کالے کالے بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور بارش ابھی ابھی ہو کر رہی ہے۔ یہاں واقعی سردی تھی اور بس میں باہر نکلتے ہی سب لوگوں نے گرم کوٹ، سویٹر اور مغلز وغیرہ اوڑھ لیے یہاں سے یہ قافلہ رکشوں، گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر اپنی کرایہ پر لی ہوئی کوشی کی طرف چل پڑا۔

مری میں کافی رونق اور چہل پہل تھی۔ اگرچہ برسات شروع ہو چکی تھی مگر لوگ باقاعدہ سڑکوں پر مڑ گشت کر رہے تھے۔ مال کے ہونٹوں میں بھی کافی رونق تھی۔ میوزک شروع تھا۔ کہیں فلمی ڈھنیں اڑ رہی تھیں اور کہیں انگریزی موسیقی جاری تھی۔ لوگ ہونٹوں کی بالکونیوں میں کھڑکیوں کے پاس بیٹھے بڑی گرجوٹی سے چاء، کافی وغیرہ بھی پی رہے تھے۔ سیر بھی کر رہے تھے اور باتیں بھی کر

رہے تھے۔

ہر آدمی گرم سوٹ اور گرم کپڑوں میں ملبوس تھا۔ عورتیں قسم قسم کے خوبصورت گرم ادنی لباس پہنے ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھیں اور بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ نرگس اپنی امی جان کے ساتھ رکشے میں بیٹھی تھی اور ہر شے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ فضا ایک دم صاف شفاف اور ڈھل ڈھلا کر نکھر گئی تھی۔ یہاں لاہور کی گرمی، گرد اور لوکانشان تک نہ تھا۔

ہر طرف صفائی اور خوشبو تھی۔ مال روڈ کے کنارے کنارے سڑک کے ذرا اونچائی پر گلاب کی جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول مسکرا رہے تھے۔ فضا میں ان پھولوں کی مہک بس رہی تھی اور پھر اس مہک میں رنگ برنگ کے ولایتی سینٹ کی خوشبو بھی مل رہی تھی۔

خواجہ صاحب نے جو کوشی کرایہ پر لی تھی اس کا نام گرین ہاؤس تھا۔ گرین ہاؤس ڈاک خانے کی عقبی سڑک پر واقع تھی۔ کوشی کافی کشادہ تھی اور بڑے پر فضا مقام پر تعمیر کی گئی تھی۔

جب یہ پورا قافلہ اس کوشی میں داخل ہوا تو سوئی ہوئی تنہا کوشی میں جان پڑ گئی۔ وہاں ایک ہنگامہ ساپا ہو گیا۔ نرگس نے سب سے پہلے کوشی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ صحن میں گلاب اور رات کی رانی کی جھاڑیاں کیاریوں میں سج رہی تھیں۔ نوکروں نے پہلے ہی تمام مکان کی صفائی کر رکھی تھی۔ نرگس جب مکان کے عقب میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں ایک پہاڑی نالہ بڑی خاموشی سے بہہ رہا ہے، اس کا صاف شفاف پانی پتھروں کے درمیان میں سے بڑی آہستگی اور محبت

سے گزر رہا تھا۔ نالے کے کناروں پر لمبی لمبی گھاس اُگ رہی تھی جس میں کہیں کہیں نیلے رنگ کے نازک ٹہنیوں والے لمبے پھول نیچے جھک کر پانی میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اوپر ایک چھوٹا سا پل تھا جہاں سے ایک پگڈنڈی گھنے درختوں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔

”زرگس بالکونی میں کھڑی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔“

اُسے یہاں کا منظر اس قدر بھلا لگا کہ اس نے فوراً اس کمرے پر قبضہ جمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کمرہ اگرچہ بہت چھوٹا تھا۔ یعنی زرگس کے لاہور والے کمرے سے آدھا تھا مگر یہاں کی فضا اور باہر کا منظر اس قدر دل آویز تھا کہ زرگس کو اس کمرے کی جدائی کسی طرح بھی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ اسی وقت اس نے اپنا مختصر سا سامان منگوا کر وہاں بستر جمایا۔ امی جان اور بھابی نے بہت سمجھایا کہ وہ کمرہ بڑا الگ تھلگ ہے۔ مگر زرگس نے کسی کی نہ سنی اور سب سے یہی کہا کہ وہ اس کمرے میں ہی رہے گی کیونکہ وہاں کی فضا مری کی بہترین فضا ہے۔ اس پر کسی نے زیادہ اعتراض نہ کیا اور زرگس اس کمرے میں آگئی۔

یہاں ایک چھوٹا سا پلنگ اور ایک میز ایک آرام کرسی پہلے ہی سے پڑی تھی۔ زرگس نے ایک تولیہ شینڈ اور آرام کرسی اور منگوا کر وہاں رکھوالی اور اپنا سوٹ کیس نیچے رکھوا لیا اس کے بعد اس نے گرم کپڑے، اپنا بہترین رنگ کا سوٹ، اونی جرسی، ہاف کوٹ وغیرہ نکلوا کر باہر رکھوائے اور خود بڑے کمرے میں آگئی۔

”یہاں ایک عجیب طرح کی مچھلی منڈی لگی تھی۔“

سامان پر سامان جما ہوا تھا، کہیں خاصداں کھلا ہوا تھا۔ کہیں سوٹ کیس الٹ رہا تھا کہیں کوئی عورت صندوق میں آدمی کھسی چیزیں نکال رہی تھی۔ میز پر دوپہر کا کھانا جو کہ ملازموں نے پہلے ہی پکا رکھا تھا لگوایا جا رہا تھا۔ غسل خانے میں گرم پانی کی بالٹیاں پہنچائی جا رہی تھیں اور بڑے زور شور سے نہایا جا رہا تھا۔

غسل سے فارغ ہو کر زرگس نے تھوڑا سا کھایا پیا اور اپنے کمرے میں آ کر کیمبل اوڑھ کر لیٹ گی۔ دن بھر کی تھکن تھی فوراً سو گئی۔ جب وہ سو کر اٹھی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ رحمن نے اسے آ کر جگایا اور بتایا کہ چاء پر سب لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ زرگس جلدی سے اٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر چائے کی میز پر پہنچ گئی۔

”خوب نیند کر لی تم نے تو بھی“ خواجہ صاحب نے فرمایا

”تھک گئی تھی ابا جان“

”ٹھیک ہے بیٹی۔ اچھا کیا، مگر ذرا گلا کھلا نہ رکھو موسم کا کوئی اعتبار نہیں“

”اور پھر ہم لوگ گرمی سے ایک دم سردی میں آگئے ہیں“

چائے کے بعد سب لوگ خوب اچھی طرح گرم کپڑوں میں ملبوس ہو کر مال روڈ کی سیر کو چل دیے۔ مال پر بڑی چہل پہل تھی۔ چونکہ آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اس لیے شام سے ذرا پہلے ہی اندھیرا ہو رہا تھا اور دوکانوں اور ہوٹلوں کے اندر بجلی کی تیاں روشن ہو گئیں تھیں۔

ان روشنیوں کا عکس باہر گیلی سڑک پر پڑ رہا تھا جو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ نرگس کی بھابھیاں اور بڑی بہن سعیدہ نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ خواجہ صاحب سمیز میں ہاٹ کافی پینا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ تو بچوں سمیت سمیز میں کافی پینے چل دیے اور نرگس اپنی بڑی بہن اور بھابیوں سمیت ایک عالی شان دوکان میں خرید و فروخت کی غرض سے داخل ہو گئیں۔

اس دوکان میں کافی رونق تھی اور لوگ جن میں زیادہ تر عورتیں اور لڑکیاں تھیں بڑی گرجوٹی سے خرید و فروخت کر رہی تھیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر یہ لوگ بھی سمیز میں اپنے گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ آن شامل ہوئے۔ سمیز ہوٹل میں اس قدر رش تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

ہال کمرے میں مغربی موسیقی کے دھن پر رقص شروع تھا۔ یہ لوگ باہر کاوشٹر کے قریب تین میزیں جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ نرگس، سعیدہ اور ان کی دونوں بھابھیاں بھی ان میں جا شامل ہوئیں۔ جس جگہ نرگس بیٹھی تھی، وہاں اسے مال روڈ کا آدھا حصہ اور ہوٹل کا تقریباً سارا فلور نظر آ رہا تھا۔ لوگ بہترین گرم کپڑوں میں ملبوس عورتوں کے ساتھ دوستوں کے ساتھ آ جا رہے تھے۔ ہوٹل کی ساری بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور وہاں کافی رونق تھی۔ فضا لوگوں کے رش کی وجہ سے گرم ہو رہی تھی۔ اس میں مختلف ولایتی عطروں اور سگریٹ اور کافی کی مہک اڑ رہی تھی۔

نرگس کے سامنے کافی کی گرم پیالیاں کھانے پینے کی بے شمار چیزیں پڑی تھیں اور وہ اپنی چھوٹی بھابی سے محو گفتگو تھی۔ دونوں ایک ایسے گرم کوٹ کے ڈیزائن کا ذکر چھیڑے ہوئے تھیں جس کا فیشن پیرس کے رسالوں میں تو عام تھا لیکن لاہور میں ابھی نہیں چلا تھا۔ سعیدہ اپنی امی سے بچوں کی علالت کا ذکر کر رہی تھیں سببہ کی چھوٹی بچی کو مری میں آتے ہی زکام ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب سگار

سگائے بڑے انہماک سے انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے اور رحمان اپنی بچی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو ایک دلچسپ مقدمے کی روئیداد سنا رہا تھا۔ اچانک نرگس بات کرتے کرتے رک گئی۔ کافی کی پیالی اس نے ہاتھ میں تھی۔ وہ وہیں کی وہیں رہ گئی۔

”کیا بات ہے؟“

چھوٹی بھابی نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں“

اس کے باوجود نرگس کے حواس درست نہ ہوئے تھے اس لیے کہ اس نے ابھی ابھی اسی نیلی آنکھوں والے لڑکے کو ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پہلی ملاقات

”نرگس کو یقین نہیں آ رہا تھا“

اس کے وہم میں بھی نہ تھا کہ وہ نیلی آنکھوں والا لڑکا کوہ مری بھی پہنچ جائے گا۔ شاید وہ کل شام ہی آتا تھا مگر وہ تو اسی ریل میں تھا اور اس وقت شام ہو چکی تھی۔ پھر وہ یقیناً آج دوپہر کو مری پہنچا ہے۔ پچھ بھی ہو وہ مری میں تھا اور نرگس کو یہ سوچ کر ایک عجیب قسم کا احساس ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے موضوع بھول گئی۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی کہ کہیں بھابی پر اس کا راز افشا نہ ہو جائے اس نے بڑی جلدی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور فوراً بڑی توجہ سے باتیں شروع کر دی۔

”تو میں تمہیں کہہ رہی تھی کہ“

مگر اس کا دل غیر حاضر تھا اور ذہن برابر اس لڑکے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا آخر وہ اتنی بے تاب کیوں ہوئی جا رہی ہے؟

اب پہلی بار اُسے اس لڑکی کا خیال آیا جو اسے لڑکے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے دل میں ایک طرح کا پراسرار جلاپا محسوس کیا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ صرف نرگس میں دلچسپی لے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔

یہ ایک ہی طرح ممکن تھا کہ نرگس اس سے اظہار محبت کرے اُسے اپنی محبت اور اپنی وفا کا یقین دلائے مگر یہ کیوں کر ہو سکتا تھا؟

”یہ ایک ہی طرح ہو سکتا تھا وہ اس سے ملاقات کرے۔“

”نرگس نے جلدی سے کافی کا گرم گرم گھونٹ پیا اور اس کے ہونٹ جل گئے۔ وہ اپنی سوچ پر بڑی شرم سار ہوئی۔“

یہ ابھی ابھی اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کس قسم کی باتیں سوچنے لگی تھی؟ اس سے پہلے تو اس نے اس قسم کے ایک بھی خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دی تھی۔ مثال کے طور پر وہ ہمسائے کا نوجوان اسے ہر روز دیکھا کرتا تھا اور اُس نے تو اس سے اظہار محبت تک کر دیا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ محبت کا مذاق اڑایا تھا۔

”پھر یہ آگ سی اس کے سینے میں کیا سلگنے لگی تھی؟“

”آپ کے پاس ماچس ہوگی“

کسی نے ساتھ والی میز پر کسی سے پوچھا پھر نرگس کو ماچس کے جلنے اور پھر پھونک سے بھجادینے کی آواز سنائی دی اور وہ پہلے سے زیادہ اداس اور پڑمردہ سی ہو گئی لیکن اُس نے اپنی اداسی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

وہ اپنی اداسی کو چھپانے کی لیے پہلے سے بڑھ چڑھ کر باتوں میں حصہ لینے لگی۔ نیلی آنکھوں والا لڑکا اپنی ساتھی کے ساتھ رقص گاہ کی طرف گیا تھا اور اب کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اندر جا کر کہیں بیٹھ گیا ہوگا۔ یا اپنی ساتھی کے ساتھ موسیقی کی دھن پر رقص کر رہا ہوگا نرگس کو بڑا افسوس ہوا کہ اس نے آج تک رقص کیوں نہ سیکھا۔

”اسے سردی محسوس ہونے لگی“

اس نے کھڑکی بند کر دی اور پردے کے پیچھے جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ کپڑے بدل کر اس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ دیوار والی جی گل کی اور کیسی اوسین کے گیتوں کا ترجمہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ لحاف میں گھس کر اس نے سر تکیوں پر رکھا اور یونہی کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ اس کی نظروں کے سامنے ذیل کی سطریں آگئیں۔

”اے ہوا، ایک پل کے لیے رک جا اے ندی تو دم بھر کے لئے بہنا بند کر دے تاکہ میری آواز سنی جاسکے۔

رات کا وقت ہے اور میں اکیلی ہوں اس پہاڑ کی چوٹی پر جو طوفانوں کا مسکن ہے بالکل اکیلی اور تنہا ہوں ہوا پہاڑوں کے اوپر سے پکار رہی ہے۔ پہاڑی نالے چٹانوں پر سے لڑھکتے ہوئے پرشور آواز کے ساتھ گر رہے ہیں

”کوئی ایسی جھونپڑی نہیں جو مجھے بارش سے پناہ دے؟“

اے چاند! بادلوں کے پیچھے سے نکل! رات کے روشن ستارو! تم لوگ ہی مجھے روشنی دکھاؤ اور اس جگہ پہنچا دو جہاں میرا محبوب دن بھر کی تھکن کے بعد اکیلا لیٹا ستارہا ہے۔ میرے محبوب! تیری خاطر میں اپنے باپ کے گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہوں۔

تیری خاطر میں اپنے عزت دار بھائی کا ساتھ چھوڑ دینے پر راضی ہوں۔ میرے تیرے گھرانوں کا آپس میں سات پشتوں کا بیر ہے۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے“

نرگس کے والد صاحب نے اچانک گھڑی دیکھتے ہوئے فرمایا۔ اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلمان نے بل ادا کیا اور سارا کنبہ میزوں کے درمیان میں سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ اس دوران میں نرگس کی نگاہیں رقص گاہ کی طرف ہی اٹھی رہیں وہ جانے پہلے صرف ایک نظر اس لڑکے کو دیکھنا چاہتی تھی۔ شاید وہ یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ رقص نہیں کر رہا، لیکن وہاں لوگوں کی بھیڑ اس قدر زیادہ تھی کہ اسے سوائے لوگوں کے سروں اور پیروں کی پکڑیوں کے اندر کچھ دکھائی نہ دیا۔

بڑی ناامیدی کے عالم میں وہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ہوٹل کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہاں سے نکل کر ان لوگوں نے پنڈی پوائنٹ کا ایک چکر لگایا اور پھر واپس گھر آ گئے۔

گھر پہنچ کر نرگس سردرد کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پرس میز پر رکھا اور کھڑکی کھول دی آسمان اُسی طرح بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اوپر سڑک پر دھیمی دھیمی بتیاں جلتی رہیں تھیں۔ باہر مکمل اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں نیچے ندی میں پانی کے بڑی نرمی سے پتھروں سے ٹکرانے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔

کھڑکی کھولنے سے ٹھنڈی ہوا کا ایک خیمونکا نرگس کے چہرے کو چھو کر گز گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یوں محسوس ہو جیسے باہر دھند سی پھیلی ہوئی ہے اور اب یہ دھند اس کے کمرے میں بھی داخل ہو رہی ہے۔

”میں ہوں بی بی رحمن“

”کیا بات ہے رحمن“

”بی بی کھانا تیار ہے“

”ابھی آتی ہوں“

لیکن نرگس کا کچھ کھانے کو بالکل جی نہ چاہ رہا تھا۔ ویسے بھی اس نے اتنا کچھ کھالیا تھا کہ اب کچھ کھانے کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن اب اس کے دل میں چور چھپا بیٹھا تھا۔ اسے خواہ مخواہ یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر وہ کھانے پر نہ گئی تو گھر والے اس پر شک کریں گے، چنانچہ وہ بادل نحواستہ اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکلی گئی۔

”دوسرے دن ایک عجیب اتفاق ہوا۔“

نرگس اپنی بڑی بہن سعیدہ اور اس کے بچوں کے ساتھ پنڈی پوانٹ کی طرف گھوم رہی تھی۔ دونوں بچے گدھوں پر سوار تھے اور وہ خود دونوں بڑے مزے سے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور باتیں بھی کرتی چلی جا رہی تھیں۔

جب وہ فوجی ہسپتال کا موز گھومیں تو نرگس نے اپنے سامنے اسی لڑکے کو دیکھا۔ اس وقت وہ بالکل اکیلا تھا اور سگریٹ ہاتھ میں سلگائے بڑے آرام سے چنگے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ سفید قمیض اور سیاہ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں وہی زرد رنگ کا سکارف تھا اور گرم سویٹر پاس ہی

”مگر میرے سالگرہ! میں اور تو ایک دوسرے کے پیری نہیں“

”سالگرہ! سالگرہ! میں یہاں ہوں۔“

”یہ ہے وہ درخت اور یہ ہے وہ چٹان! تو نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟“
آؤ خزاں کی ہواؤ! ویرانے میں چلو۔ پہاڑی نالوزور زور سے گرجو! طوفانو! میرے درختوں کے جھنڈوں میں شور مچاؤ!

سیاہ بادلوں میں چھپے ہوئے چاند! تو بھی جھانک جھانک کر اپنا زرد چہرہ دکھا اور مجھے وہ رات یاد دلا جب میرے بچے ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اترے تھے!
تو مجھے کیوں جگا رہی ہے اے بہار؟ تیری آواز مجھے اپنی طرف بلاتی ہے اور کہتی ہے۔ میں تجھے آسمانی شبنم سے تروتازہ کرتی ہوں، لیکن میرے اُجڑنے کا وقت قریب آچکا ہے۔
وہ طوفان آنے والا ہے جس کے ہاتھوں میرے پتے جھڑ جائیں گے۔ کل مسافر آئے گا۔

وہ آئے گا جس نے مجھے پوری شان و شوکت کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس کی آنکھیں مجھے اپنے ارد گرد کھیت میں تلاش کریں گی۔ لیکن مجھے نہ پائیں گی

نرگس کے ہاتھوں میں کتاب کا پنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے کتاب میز پر رکھ دی اور خاموش، آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

”دروازے پر دستک ہوئی“

”کون؟“

جنگلے پر لٹک رہا تھا۔ وہ بھی نرگس کو دیکھ کر ذرا چوکنسا ہو گیا۔ اس کے بعد لبوں پر وہی ریل کے سفر والی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور سگریٹ خود بخود ہونٹوں کی طرف آ گیا۔

”نرگس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔“

اس کے قدم ذرا سے لڑکھڑائے مگر اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُس نے بظاہر بڑی بے نیازی سے نیلی آنکھوں والے لڑکے کو دیکھا اور پھر اپنے دھیان میں بڑی بہن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور باتوں میں مشغول ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دور آگے نکل گئی، اور خواہش کے باوجود اسے اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ آیا وہ لڑکا وہیں بیٹھا ہے یا اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اس نے بڑے بہانے سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکا ابھی تک اُسی جنگلے پر بیٹھا تھا اور شاید اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کم از کم نرگس کو یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ مسلسل اسے نکلے جا رہا ہے۔ پنڈی پوائنٹ کا پورا چکر لگا کر وہ دونوں واپس ہو گئیں۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ چمکیلی دھوپ چمک رہی تھی اور ذرا گرمی سی ہو گئی تھی۔ اب واپسی پر نرگس کا دل پھر بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ لڑکا بدستور جنگلے پر بیٹھا ہے اور اسے ایک مرتبہ پھر اس کے قریب سے گزرتا ہے۔

اس نے سوچا، کاش وہ اکیلی ہوتی! پھر شاید وہ اسے بلا لیتی۔ یا شاید وہ خود اسے بلا لیتا۔ وہ اس سے باتیں کرتی اور اس سے کم از کم یہ تو ضرور پوچھتی کہ اس نے اتنی جرات کیوں کی تھی کہ بنا جان

پہچان اے سلام کر دے۔

نرگس نے جلدی سے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔ کیونکہ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔

جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا تھا نرگس کچھ پریشان سی ہو رہی تھی اور اس کی باتیں غیر دلچسپ اور اکھڑی اکھڑی سی ہو رہی تھیں۔ مگر لڑکی ہوشیار تھی۔ پڑھی لکھی تھی، اس نے سعیدہ پر ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُس کے دل و دماغ میں کون سے طوفان دست و گریباں ہیں

”میرے اللہ! اب وہ سامنے بیٹھا تھا۔“

اسی طرح بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ سگریٹ پیتے ہوئے، لبوں پر وہی معنی خیز مسکراہٹ اور گلے میں وہی زرد رنگ کا سکارف

”نرگس کو پسینہ سا آ گیا۔“

بہر حال وہ اس کے قریب سے گزر گئی۔ قریب سے گزرتے ہوئے وہ اپنی بہن کے ساتھ خاموش ہونے کے بجائے بڑی گرمجوشی سے باتیں کرنے لگی تھی۔ اسے یونہی وہم سا ہونے لگا تھا کہ ہر آدمی اس پر شک کرنے لگا ہے اور ہر شخص کو اس کے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے۔

”حالانکہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ تھی۔“

اب وہ مال روڈ پر تھی اور پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتی تھی یا اگر چاہتی بھی تھی تو اسے ایسے ماحول

ہوئے تک رہا تھا۔

زگس جلدی سے پرے ہٹنے لگی لیکن کسی انوکھے جذبے نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور وہیں بیٹھ رہی اب وہ کتاب میں ایک لفظ نہ پڑھ سکتی تھی۔ لفظ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ ایک ہی سطر کو بار بار پڑھتی رہی یا پڑھنے کی کوشش کرتی رہی۔

”اس دوران میں وہ چوری چوری نککیوں سے اوپر دیکھ لیتی تھی۔“

وہ نیلی آنکھوں والا اجنبی کسی قدر ثابت قدمی مستقل مزاجی اور سکون کے ساتھ پتھر کے پل پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا، سویٹر اس کے گھٹنوں پر تھا اور گلے میں وہی زرد سکارف پڑا تھا۔

زگس بھی اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی وقت گزرنے لگا گزرتا گیا، گزرتا گیا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر گیا، زگس کی آنکھیں تھک گئیں۔ اس نے کتاب اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور خود اٹھ کھڑی ہوئی اُس نے باہر دیکھا۔

”لڑکے نے پھر اسی انداز میں آہستہ سے ہاتھ اٹھا کر سلام کر دیا۔“

”زگس کو یکدم غصہ آ گیا اور اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔“

”اس نے پھر وہی حرکت کی! پھر وہی جرات کی!“

”وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ آخر اس کا کیا علاج کیا جائے۔“

”تم بھی اسے سلام کر دو نا“

میں مناسب خیال نہ کرتی تھی۔ لیکن جب وہ ڈاک خانے کا موڑ گھوم کر دوسری سڑک پر اترنے لگی تو اس نے پھر بڑے خاص انداز کے ساتھ پیچھے دیکھ ہی لیا۔

”وہ کانپ گئی۔“

وہ لڑکا ذرا فاصلے پر سویٹر کندھے پر ڈالے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اب وہ دونوں اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر نکل آئی تھیں جو ان کی کوشی کی طرف چلی گئی تھیں۔

کوشی کے باہر لان میں اس کے دونوں بڑے بھائی اپنی اپنی بیگموں اور بچوں کے ساتھ گیند بلا کھیل رہے تھے اور وہاں خوب شور مچ رہا تھا۔ زگس وہاں جا کر ان میں شامل ہو گئی۔

اس نے سب کی آنکھ بچا کر دوسری سڑک کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا اب وہاں نہیں تھا اس نے اوپر نگاہ دوڑائی تو وہ اسے دور چیرھ کے درختوں میں سے گزرتا ہوا دکھائی دیا۔

زگس وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تیسرے پہر چائے سے فارغ ہو کر زگس اپنے کمرے میں آ گئی اور کھڑکی کے پاس کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ اسے وہاں بیٹھے بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا تھا اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کی نگاہیں اپنے آپ کھڑکی کے باہر چلی گئیں فرط حیرت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

سامنے، ذرا اوپر، ندی کے پل پر وہی لڑکا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور اُسے کھڑکی میں بیٹھے

”یہ آواز نرگس کے دل کی گہرائیوں سے پیدا ہوئی تھی“
 ”کبھی نہیں کبھی نہیں“

نرگس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ ایسی غیر معقول حرکت کبھی نہیں کرے گی۔ وہ ویسے اُسے بلا لے گی مگر یوں بیوقوفوں کی طرح سلام نہیں کرے گی۔

اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر دراز میں سے باہر دیکھنے لگی وہ ابھی تک ٹانگیں پھیلائے اس طرح ندی کے پل پر بیٹھا تھا۔ اب اس نے سوٹر پہن لیا تھا۔
 اب نرگس کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے خواہ مخواہ کھڑکی کیوں بند کر دی۔ کیونکہ اس کا جی کھڑکی کھول دینے کو چاہ رہا تھا۔ مگر اب اگر وہ ایسا کرتی تو اس کی پوزیشن کافی ہلکی ہو جاتی۔ وہ لڑکا یقیناً یہی خیال کرے گا کہ نرگس اس سے پیار کرنے لگی ہے۔

”اور وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں!“

”آہ! محبت کی یہ ظاہری اور جھوٹی ملمع کاری!“

نرگس پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹھٹھلنے لگی۔ وہ ہر بار کھڑکی کے قریب آ کر اس کی دراز میں سے باہر دیکھ لیتی۔ ایک بار جب اس نے کھڑکی کی دراز میں سے باہر جھانکا تو اسے وہ لڑکا وہاں سے سے اٹھ کر واپس جاتا نظر آیا۔

”اس کا جی چاہا کہ وہ رو دے۔“

”اس نے کسی غیر شعوری جذبے کے تحت خود بخود کھڑکی کھول دی“

درختوں میں پگڈنڈی کا موڑ گھومتے ہوئے اس لڑکے نے آخری بار پلٹ کر نگاہ دوڑائی اور جب کھلی کھڑکی میں نرگس کو کھڑے دیکھا تو وہیں رک گیا اور ہاتھ اٹھا کر نرگس کو رخصتی کا سلام کیا۔
 ”نرگس نے فوراً کھڑکی بند کر دی“

اس کے ساتھ ہی وہ ہنس پڑی اور اس کا چہرہ کسی نامعلوم مسرت کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔

اب اُس لڑکے کا یہ معمول ہو گیا کہ روزانہ تیسرے پہر وہاں آ کر پل پر بیٹھ جاتا اور کچھ دیر تک وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ یا اخبار ساتھ لے آتا اور وہاں اکیلا بیٹھا اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ وہاں سے شاذ و نادر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر پانچ منٹ کے بعد کھڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لینا کبھی نہ بھولتا تھا۔

شروع شروع میں تو نرگس کو یہ روز کا دھند بڑا برا لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اس کی عادی ہو گئی اور اسے بھی اس کھیل میں ایک طرح کا لطف سامنے لگا۔

اب وہ بھی اس دوران کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی اور کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے نگاہ اٹھا کر پل کی طرف دیکھ لیتی۔ جب کبھی حسن اتفاق سے ان دونوں کی نگاہیں ٹکراتیں تو لڑکا آہستہ سے ہنس پڑتا اور نرگس بھی زیر لب اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکتی۔

ایک دوبار نرگس نے اس لڑکے کو مال روڈ پر دیکھا لیکن اس کے ساتھ اب وہ لڑکی کبھی

دکھائی نہ دی تھی۔ نرگس کو اس تبدیلی سے بڑی تسکین حاصل ہوئی، نہ معلوم کیوں وہ اسے لڑکے کے ساتھ کسی بھی لڑکی کو نہ دیکھ سکتی تھی۔

اسی طرح دس پندرہ دن گزر گئے اور ان دنوں کا رومان دور دور کے دیکھ لینے اور لگی دل کی بجھالینے سے آگے نہ بڑھ سکا اب نرگس کسی حد تک اس لڑکے کے ساتھ بے تکلف سی ہو گئی تھی۔ اب وہ کھڑکی میں آتے ہوئے وہ جھجک محسوس نہ کرتی تھی۔

بلکہ اب تو دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے وہ لڑکا تو اس سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ دور ہی دور سے نرگس کو کچھ اشارے بھی کرنے لگا تھا۔ جس کا اس نے کبھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ نرگس کو اس قسم کی حرکتیں ناپسند تھیں۔

کسی وقت اسے اس خیال سے بڑی تسکین ہوا کرتی تھی کہ وہ ایسے لڑکے کے قریب ہوتی جا رہی ہے جو صاف ستھرا اور خوبصورت ہے۔ جس کی آنکھیں نیلی ہیں اور بال سنہری ہیں اور جس کے گلے میں پڑا ہوا زرد رومال بڑا بھلا لگتا ہے۔ نرگس کو یقین تھا کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اونچے طبقے کا فرد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی تعلیم و تربیت کا مالک ہے۔

”لیکن اس نے سلام کیوں کیا؟“

یہ حرکت نرگس کو کبھی پسند نہ آ سکتی تھی۔ یہ بالکل عامیانہ سی بات تھی کہ آپ جا رہی ہوں اور کوئی دور سے بنا کسی واقفیت کے محض رومان لڑانے کے خیال سے آپ کو سلام کر دے اور پھر اس بات کی توقع ظاہر کرے کہ آپ بھی اسے سلام کریں گی۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اسی سلام نے

نرگس کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یہی وہ پہلا جھنڈا تھا جو اس کی زندگی کے قلعے پر فاتحانہ لہرا رہا تھا۔

”چنانچہ ایک دن وہ ہو کر رہا جس کا وہ دونوں انتظار کر رہے تھے۔“

نرگس کو اس کی ایک سہیلی کا خط ملا کہ وہ فلاں تاریخ کو مری پہنچ رہی ہے لہذا وہ اسے گھر پر آ کر ضرور مل جائے۔ ایک روز نرگس اپنی ملازمہ کے ساتھ صبح ناشتے کے بعد اسے ملنے چل دی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ملازم کو واپس روانہ کر دیا اور خود اپنی سہیلی کے ہاں ٹھہر گئی۔

دو گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے اکیلی واپس نکلی تو آسمان پر ایک دم کالے کالے بادل چھا گئے۔ پہاڑوں پر تو ایسی ہی برسات ہوا کرتی ہے آن کی آن میں بادل چھا گئے اور یا تو برس کر نکل گئے اور یا درود روز تک برستے رہے۔

نرگس شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس کا ارادہ ہوا کہ ایسی بھی کون سی بات ہے۔ اپنا مکان بھی کوئی خاص دور نہیں اور اگر بارش آ بھی گئی تو وہ پکھل تو نہیں جائے گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی نرگس نے ہمت سے کام لیا اور جلدی جلدی گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی وہ چند گز کے فاصلے پر ہی پہنچی ہوگی کہ ایک دم بڑے زور کا مینہ برسنے شروع ہو گیا۔ بارش اس قدر اچانک اور اس شدت کے ساتھ شروع ہوئی تھی کہ ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو گیا۔ اب آگے یا پیچھے پلٹنا ناممکن تھا۔ اگر نرگس بھاگ کر قریب ہی

درختوں میں گھرے ہوئے ایک شیلٹر میں پناہ نہ لیتی تو اس کے تمام گرم کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا۔

شیلٹر کے اوپر لکڑی کی محراب دار چھت پڑی تھی اور درمیان میں چھوٹا سا سبز بنچ رکھا تھا۔ یہاں پہنچ کر نرگس نے جب پرلی جانب گھاٹی میں نگاہ دوڑائی تو اسے محسوس ہوا کہ بارش بڑی موسلا دھار ہو رہی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بادل اب سڑک پر درختوں کے درمیان اتر آئے تھے اور نرگس کے چہرے کو چھوتے ہوئے گزر رہے تھے

نرگس نے اپنے گرم کوٹ کے کالر چڑھائے اور مفلر کو گلے کے ارد گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ یہ بڑی اچھی بات ہوئی تھی کہ وہ مفلر بھی ساتھ ہی لیتی آئی تھی۔ کیونکہ بارش کے ساتھ ساتھ سرد ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ نرگس بنچ پر بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ ذرا بارش میں کمی ہو اور وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچ جائے۔ اگرچہ وہ بزدل لڑکی نہ تھی پھر بھی اس طرح اکیلے اور تنہا مقام پر بیٹھے بیٹھے اُسے ایک عرصے کا ہلکا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

وہاں بیٹھے اُسے بمشکل دو تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک آدمی سڑک پر نمودار ہوا۔ اس کا آدھا چہرہ اور کوٹ کے اٹھے ہوئے کالر میں چھپا ہوا تھا اور وہ بھاگتا ہوا اُسی شیلٹر کی طرف چلا آ رہا تھا جہاں نرگس نے پناہ لے رکھی تھی۔

نرگس ڈر گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک دم وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن پھر اس نے اپنے اندر پورا پورا اعتماد پیدا کر لیا اور وہیں بیٹھی رہی۔

اتنے میں وہ آدمی بھاگ کر وہاں آن داخل ہوا اور بڑے اطمینان سے دوسری طرف منہ کر کے اپنا مفلر نچوڑنے لگا۔

”تو یہ بارش کی بھی حد ہوئی ہے“

اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور مفلر نچوڑنے کے بعد اس بنچ پر ڈال کر سکھانے لگا اس کے بعد جیسے کسی نے اتہائی حیرت سے کہا

”ارے آپ؟ مائی گاڈ؟“

نرگس نے پلٹ کر اجنبی کی طرف دیکھا اور وہ دھک رہ گئی۔ اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جس کی طرف دیکھ کر وہ دور ہی دور سے مسکرایا کرتی تھی۔ نرگس کی کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور ہاتھ ٹھنڈے سے پڑ گئے۔ اب اُس نے دیکھا کہ بنچ پر جو مفلر یا رومال سکھانے لیے ڈالا گیا تھا وہ زرد رنگ کا تھا۔ نرگس نے فوراً نظریں جھکالیں، مگر اس دروان میں اس نے دیکھا لیا تھا کہ اُس لڑکے کی آنکھیں نیلی تھیں اور بڑی خوبصورت تھیں۔ ناک ستواں تھا۔ رنگ سرخی مائل گورا اور چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک اور شگفتگی تھی۔

”اُس لڑکے نے سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ منہ میں دبا کر سلگایا اور دیا سلائی پاؤں تلے مسل کر بنچ پر بڑے آرام سے بیٹھ گیا“

”پھر ذرا سا ہنس کر کہنے لگا“

”کیسا عجیب اتفاق ہے، بلکہ حسن اتفاق ہے؟“

اس کی آواز گہری اور خواب آور سی تھی جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہو اس آواز میں ذہنی

سکون اور قلبی اطمینان ہویدا تھا۔ نرگس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ذرا پرے کھسک گئی۔

”وہ جلدی سے بولا“

”مجھ سے دور نہ بنیں۔ پھر واپس آنا پڑے گا، اس کے علاوہ بیچ چھوٹا ہے اور پرلی طرف

گہری گھاٹی ہے“

نرگس کو اس کی یہ بات عجیب سی لگی، لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی اور اس نے اس کا کوئی

جواب نہ دیا۔ بارش بدستور موسلا دھار ہو رہی تھی۔ نرگس نے اپنی کلائی پر وقت دیکھا۔

”زیادہ وقت نہیں ہوا۔ ابھی تو بارش شروع ہوئی ہے اور یہاں کی بارش ایک بار شروع ہو

جائے تو دو دور ورتک ہوتی رہتی ہے۔

”نرگس گھبراہٹ سے گئی اس نے جلدی سے کہا“

”لیکن مجھے تو گھر پہنچنا ہے“

”وہ لڑکا ہنس پڑا، اس کی نیلی آنکھوں میں بڑی معصوم شرارت چمک رہی تھی“

”آپ فکر نہ کریں آپ کو صحیح وسالم گھر پہنچا دیا جائے گا۔“

یہ بات اتنے مانوس لہجے میں اور ہمدردی سے کہی گئی تھی کہ نرگس کی ہمت بندھ گئی اور وہ

ذرا اطمینان سے بیٹھ گئی۔

”میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”نرگس نے کوئی جواب نہ دیا“

”کوئی بات نہیں بقول شیکسپیر نام میں کیا رکھا ہے۔ بہر حال میرا نام محمود ہے میرے

والدین راوولپنڈی کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد صاحب ریٹائرمنٹ ہیں اور میں لاہور کے

میڈیکل کالج ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو کبھی زکام نزلایا بخار ہو تو بندہ کو یاد کرنا کبھی

نہ بھولیے گا۔ ایسا نسخہ بتا دوں گا کہ عمر بھر بیماری نہ ہوگی“

”نرگس ذرا مسکرائی“

”بہت خوب! گویا آپ مسکراتا بھی جانتی ہیں بھی معاف کریں میں تو کچھ اور ہی سمجھا

تھا“

”اس کے بعد ذرا دیر تک خاموشی رہی پھر وہ بولا“

”اچھا بھلا ایک بات تو بتائیں؟ پوچھوں؟“

”نرگس نے کوئی جواب نہ دیا“

”پوچھیں تو کوئی؟“

”نرگس بدستور چپ رہی“

”بھئی بڑی ضدی ہیں آپ، اچھا نہ پوچھیں، میں خود ہی پوچھے لیتا ہوں۔ یہ بتائیں کہ

آپ میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا کرتیں؟“

”نرگس نے فوراً پوچھا“

”اور آپ مجھے سلام کیوں کیا کرتے ہیں؟“

”محمود نے جواب دیا۔“

”ارے بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا، سلام کیوں کیا کرتے ہیں؟ اس لیے کہ

ہم مسلمان جب کسی کی سلامتی چاہتے ہیں اور کسی سے ملتے ہیں تو سلام ہی تو کرتے ہیں کیا ہم ایسا

نہیں کرتے؟“

”ٹھیک ہے لیکن جہاں جان پہچان نہ ہو وہاں یہ بات اچھی نہیں لگتی“

”ارے بھئی اسی طرح تو جان پہچان ہوتی ہے۔ جہاں جان پہچان نہ ہو وہاں کیا پتھر مارا

کرتے ہیں؟“

”آپ تو عجیب باتیں کرتے ہیں“

”محمود ہنس پڑا۔“

”ویسے آپ بھی عجیب باتیں پوچھ رہی ہیں“

ایک بل کے لیے پھر وہی خاموشی طاری ہوگئی۔ نرگس کا دل اب اس طرح نہ دھڑک رہا تھا۔ محمود نے دو تین ہی باتوں میں آپ کی اجنبیت کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ اب اُسے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اُسے مدت سے جانتی ہے جیسے وہ اس کے گھر کا ہی ایک فرد ہے اور وہ اس سے پہلے کئی بار اس کی گفتگو ہو چکی ہے۔ محمود نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

”یقین کریں میری وہ حرکت بالکل غیر شعوری تھی۔ میں لوگوں کو سلام کرنے کی عادی نہیں ہوں، بلکہ رشتہ داروں میں صرف اس لیے بدتمیز سمجھا جاتا ہوں کہ میں نے انہیں کبھی ہاتھ اٹھا کر سلام نہیں کیا، لیکن جب آپ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار ریل کے ڈبے میں دیکھا تو بے اختیار ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھ گیا“

”نرگس کا چہرہ شرم سے سرخ ہونے لگا۔“

”میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا تھی یہ بالکل ایسے ہی تھا، جیسے ہم سورج کی طرف منہ کرتے

ہیں اپنا ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھا لیتے ہیں تاکہ آنکھوں پر سایہ کر سکیں۔ یقین کریں مجھے بھی اس وقت معلوم ہوا جب میں آپ کو سلام کر چکا تھا اور آپ نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا تھا۔ کیا میری یہ حرکت آپ کو بڑی لگتی تھی؟“

نرگس حیا سے لال ہو رہی تھی، جواب کہاں سے دیتی بس نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر وہ جواب دینا بھی چاہتی تو جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس لیے کہ سوال ہی ایسا تھا۔

”کیا آپ کو یہ بات بڑی لگتی تھی؟“

”نرگس خاموش رہی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بڑا محسوس نہیں ہوا۔ خوب! میرا بھی یہی خیال تھا۔ کیونکہ میں نے بڑے خلوص اور نیک نیتی سے آپ کو سلام کیا تھا۔ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی کھوٹ ہوتا تو آپ یقیناً اس کا بڑا امانتیں، لیکن ایسی بات نہ تھی۔“

نرگس گھبرانے لگی کہ کہیں بات زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔ اُس نے جلدی سے کہا

”یہ بارش کب رُکے گی؟“

محمود ہنس پڑا۔

”آپ بات بدلنا چاہتی ہیں؟ تو لیجئے ہم بھی لائن تبدیل کر دیتے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ شاید یہ بارش ساری رات ہوتی رہے گی“ نرگس سہم گئی۔

”ایسا نہ کہیں مجھے تو گھر جانا ہے۔ وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے میں کیا کروں؟“

”آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگر بارش اسی طرح ہوتی رہی تو میں آپ کو یہاں سے اس طرح محفوظ نکال کر گھر پہنچا دوں گا جس طرح بالوں میں سے مکھن نکالا جاتا ہے“

”نرگس ہنس پڑی“

”آپ نے محاورہ غلط بول دیا ہے“

”محمود نے کہا“

”جی ہاں! میں نے قصد ایسا کیا ہے۔“

”وہ کیوں“

”وہ اس لیے کہ میں محاوروں کا جانی دشمن ہوں میں ان کے لیے سنگدل قصاب ہوں اور وہ میری بھیڑیں ہیں۔ میں جب اور جس وقت چاہتا ہوں ایک بھیڑ کو، ایک محاورے کو کان سے پکڑتا ہوں اور ذبح کر دیتا ہوں۔“

”نرگس کھلکھلا کر ہنس پڑی۔“

”آپ بڑے دلچسپ ہیں“

”یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ من دامن کہ میں کیا ہوں۔ ویسے کیا آپ ایک

دفعہ پھر ذرا اسی طرح ہنس سکتی ہیں؟“

”کیوں؟“

”کچھ نہیں۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے سونے کی طشتی فرش پر گر پڑی ہو۔“

”نرگس شرما گئی لیکن جلدی سے اس شرم پر قابو حاصل کرتے ہوئے بولی“

”معلوم ہوتا ہے آپ شاعر بھی ہیں؟“

محمود نے سگریٹ بارش میں پھینکتے ہوئے دوسرا سگریٹ سلگالیا۔

”آپ کے پاس بیٹھ کر میں شاعر ہی نہیں اور بھی بہت کچھ بن سکتا ہوں۔ کیا آپ کو اس

میں شک ہے؟“

”نرگس پھر شرما گئی۔“

”دیکھئے آپ اس قدر شرمائیں نہیں ورنہ بارش کبھی نہیں رکے گی“

”نرگس نے جلدی سے کہا“

”لیکن یہ بارش کب رُکے گی؟“

بارش اُسی رفتار، اسی تیزی اور اُسی شدت کے ساتھ ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بادل نے آج فیصلہ کیا ہے پہاڑوں کا دل گداز کر دیا جائے بلکہ اب بجلی بھی کڑکنے لگی تھی۔ نرگس کو بڑا فکر لگا ہوا تھا۔ اگر بارش اسی طرح ہوتی رہی تو وہ کب تک یوں بیٹھی رہے گی۔ علاوہ ازیں سردی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اگر وہ بارش میں بھیکتی ہوئی بھی گھر تک چلی جائے تو نمونیہ یقینی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا دل بے حد خوش اور پر گرم تھا۔ اُسے اس بات سے روحانی خوشی حاصل ہو رہی تھی کہ آرزو کو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بہلایا کرتی تھی۔ جس کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر اس کی گہرائیوں میں دیکھنے کی خواہش نے اسے بے چین کر رکھا تھا اور اُسے اس بات کو معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ کسی

ایسے ہی نوجوان سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔

اگرچہ کبھی اُس نے اپنی سہیلیوں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ خواہش اس کے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لیا کرتی تھی۔ آج اس نے اپنی آرزوؤں کو اپنے بالمقابل کامرانی کے گیت گاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ آج اس کا دل خوشی سے لبریز تھا اور اس کا انگ انگ محبت کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ حقیقت یہ تھی اُسے محمود سے محبت ہو گئی تھی اور اب وہ اس محبت کو ہر قیمت پر محمود سے چھپا رہی تھی۔ وہ اسے چھپانا چاہتی تو نہیں تھی مگر اس وقت اس نے ہی مناسب خیال کیا تھا۔ وہ پہلے محمود کے دل کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لینا، پرکھ لینا چاہتی تھی۔ کہیں کسی کو نہ کھدرے میں کوئی دوسری لڑکی، کوئی دوسری محبت تو نہیں سمٹی ہوئی ہے یہ سوال بار بار اس کے ہونٹوں تک آیا تھا کہ وہ محمود سے پوچھے کہ وہ لڑکی کون تھی جو اس روز اُس کے ساتھ ہوٹل میں آئی تھی، مگر ہر بار اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ اُس سے یہ سوال پوچھے چنانچہ ہر بار وہ خاموش ہو کر اس سب سے اہم سوال کو اپنے دل ہی دل میں دبا کر بیٹھ رہی تھی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے صرف اتنا کہا

”آپ وہاں بل پر نہ آیا کریں۔ اگر کسی کو شک ہو گیا تو بڑی مصیبت آجائے گی۔“

”محمود نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا“

”تو پھر آپ کو کیسے اور کہاں دیکھا کروں؟“

”کیا مجھے دیکھنا اتنا ضروری ہے؟“

”محمود نے نرگس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نرگس نے ایک دم نظریں

جھکا لیں۔“

”ہاں! اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر پرندے..... کھلی فضا، مچھلی کے لیے پانی اور پھول کے لیے شبنم کا گرنا ضروری ہے تو میرے لیے بھی آپ کو دیکھ لینا ضروری ہے۔ اگر پرندہ بغیر کھلی فضا کے، مچھلی بغیر پانی کے اور پھول بغیر شبنم کے زندہ رہ سکتا ہے تو پھر میں بل پر نہیں آیا کروں گا“

نرگس کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں اس کی بوندیں پٹکا دی ہوں۔ اس کا دل خوشی اور مسرت کے ایک گہرے جذبے سے جھوم گیا۔ لیکن اُس نے اپنے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ حیرت اور تشویش کا اظہار کیا۔

”لیکن آپ اگر میری خیر خواہی چاہتے ہیں تو وہاں نہ آیا کریں۔“

”محمود گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور بڑے اداس لہجے

میں بولا“

”یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ میں آپ کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا اور آپ کو دیکھے بنا بھی

نہیں رہ سکتا۔“

”کچھ بھی ہو آپ وہاں نہ آیا کریں۔ میرا مطلب ہے اس طرح باقاعدگی سے نہ آیا

کریں۔ کبھی کبھی بے شک چلے آیا کریں“

”محمود مسکرانے لگا۔“

”مجھے آپ کی اس بات سے بڑی تسکین ہوئی ہے۔ اس نے میری پریشانی کو ہی دور نہیں

کیا بلکہ مجھے میری بہت سی باتوں کا جواب دے دیا ہے“

”نرگس نے دل ہی دل میں اپنا جملہ کئی بار دہرایا، مگر اسے کچھ بھی معلوم نہ ہوا کہ اس ایک چھوٹے سے جملے میں اتنے سارے جواب کیسے پنہاں تھے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“

”مگر میں سمجھ گیا ہوں۔“

”اب بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا، مگر مینہ رکا نہیں تھا۔ ہوا بھی قدرے ہلکی ہو گئی تھی اور بجلی نے بھی کڑکنا بند کر دیا تھا۔ نرگس نے کہا۔“

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ طوفان گزر گیا ہے۔“

”محمود نے کہا۔“

”اس سے پہلے کہ آپ نہ معلوم عرصے کے لیے مجھ سے جدا ہوں۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ جواب دیں گی؟“

”پوچھئے“ نرگس نے بڑے ڈرتے ڈرتے کہا

”محمود ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ پھر بولا۔“

”کیا آپ مجھ سے کبھی یونہی مل لینا، مل کر ایک آدھ بات کر لینا، گوارا کریں گی؟“

نرگس سوچ میں پڑ گئی وہ چاہتی تھی کہ محمود اس سے ایسا سوال کرے مگر اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ وہ اس کو جواب کیوں کر دے۔ کیا وہ اسے صاف صاف کہہ دے کہ وہ جب چاہے گا وہ اسے ملنے آجائے گی؟ نہیں اُسے ابھی یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ چنانچہ وہ خاموش ہو رہی۔

”کیا آپ خاموش رہیں گی؟“

نرگس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر محمود کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ نرگس بھی ہنسنے لگی۔ اب بارش تھم گئی تھی اور صرف ہلکی ہلکی بوند باندی ہی ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بارش بھی اس انتظار میں تھی کہ ان کی پریم بھری باتیں ختم ہوں تو میں رخصت طلب کروں۔ اب وہ دونوں وہاں سے نکل کر باہر آ گئے اور ساتھ ساتھ درختوں سے گزرنے لگے۔

سڑک سنسان تھی اور درختوں کی شاخوں پر سے بارش کی رکی ہوئی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر نرگس نے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اب آپ چلے جائیں میرا گھر سامنے ہے۔“

محمود وہاں رک گیا۔ دونوں نے آخری بار ایک دوسرے کو دیکھا اور جدا ہو گئے۔ نرگس جلدی جلدی قدم اٹھاتی اپنی کونٹھی کے لان میں داخل ہو گئی برآمدے میں پہنچ کر اس نے واپس نگاہ درڑائی

”محمود ابھی تک وہاں کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆

آغاز بہار

”اس رات نرگس دیر تک جاگتی رہی۔“

اس نے کئی بار سونے کی کوشش کی مگر اُسے بالکل نیند نہ آئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب وہ بارش سے بچنے کے لیے درختوں کے نیچے اُس پناہ گاہ کی طرف بھاگی تھی اور جہاں پہلی بار محمود سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں محمود کی باتیں اپنے آپ کو دہرا رہی تھیں اور کتنی رات گئے تک ان باتوں کے طلسم میں گم سم لیٹی رہی۔ اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اب اُسے زندگی ایک ایسا ڈرائنگ روم دکھائی دے رہی تھی جہاں ہر ایک شے بڑی قرینے سے سج رہی ہو۔ کھڑکیاں لمبے لمبے رنگین پردوں سے ڈھکی ہوئی ہوں۔ قالین پر صاف سترے صوفے پڑے ہوں۔ کارنس پر چینی کے گلدان میں گیندے اور کیسری کے پھول خوشبو اڑا رہے ہوں۔ اس سے پہلے اس کی زندگی ایک پرانی حویلی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جس کی دیواریں جگہ جگہ سے اکھڑ رہی ہوں۔ صوفوں پر گرد جمی ہو اور دہلیزوں میں گھاس اُگ رہی ہو۔

اس زبردستی تبدیلی نے نرگس کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع کر دیا تھا اور اُسے ہر طرف روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس روشنی کے وسط میں وہ نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سفید ابر پارے کی طرح کسی نامعلوم بہشت کی جانب رواں تھی۔ اگرچہ اس نے محمود کو ندی کے پل پر آنے سے روکا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ ہر روز شام کو وہاں آکر اسے اپنا خوبصورت چہرہ دکھایا کرے۔

”اگر وہ وہاں نہ آیا تو پھر اسے کہاں مل سکے گی؟“

یہی خیال تھا جو کسی وقت نرگس کو پریشان کر جاتا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ جہاں بھی ملاقات ہوگی وہ اسے کہہ دے گی کہ وہ ایک دن چھوڑ کر پل پر ضرور آجایا کرے۔ انہی خیالوں میں جوانی کے رنگین سپنے دیکھتے دیکھتے جب کافی رات گزر گئی تو دوبارہ آہستہ آہستہ بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ نرگس نے لحاف میں لیٹے لیٹے مہریری سی لی اور لحاف کو اچھی طرح ارد گرد لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی جانے کس وقت اُسے نیند آگئی۔ جب جاگی تو شرقی پہاڑوں کے اوپر سورج، سنہرا طلوع ہو چکا تھا اور نیچے کی وادی میں اپنا سونا لٹا رہا تھا۔

دن بڑا خوشگوار تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد نرگس باہر کونٹھی کے لان میں آگئی۔ یہاں گھر کے تقریباً سبھی افراد بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ چھوٹی یاسمین اور جاوید نے درخت پر جھولا ڈال رکھا تھا اور وہ دونوں باروچی کی مدد سے جھولا جھول رہے تھے۔ نرگس کے والد ذرا پرے ہٹ کر رات کی رانی کے پودوں کے پاس آرام کرسی پر نیم دراز اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے پاس ہی رحمان بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔

ایک گوشے میں امی جان آرام کرسی پر بیٹھی، گھٹنوں پر شمال ڈالے اپنے دستانے بن رہی تھیں۔ پاس ہی سعیدہ بہن بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی اور اپنے چھوٹے بچے سے کھیل رہی تھی۔ نرگس کو لان میں بیٹھا دیکھ کر چھوٹی بھابی بھی کمرے سے باہر نکل آئی اور نرگس کے پاس بیٹھ کر دھوپ تاپنے اور باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر یہاں بیٹھنے کے بعد نرگس اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں آکر اس نے اپنی کتاب اٹھائی اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی

دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور ملازم نے نرگس کو ایک خط دیا۔

”کس کا خط ہے“

”آپ کا بی بی“

نرگس نے فوراً لفافہ لے کر پڑھا۔ تحریر نیلم کی معلوم ہوتی تھی۔ نرگس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا نیلم نے لکھا تھا۔

پیاری نرگس!

میں کل صبح مری پہنچ رہی ہوں۔ تمہیں جلدی خط اس لیے نہ لکھ سکی کہ پروگرام ابھی طے نہیں ہوا تھا میں نے ایک خط چچی جان کو بھی لکھ دیا ہے۔ ہم لوگ کل صبح راولپنڈی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہاں گرمی بہت شدت اختیار کر گئی ہے۔ باقی زبانی باتیں ہوں گی۔

تمہاری نیلم

”نرگس کو اس خط سے بڑی خوشی ہوئی“

نیلم اس کی بڑی قریبی سہیلی تھی اور وہ اس کے ساتھ ہر قسم کی بات کر سکتی تھی۔ دراصل اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی سہیلی مل جائے جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ گھنٹوں محمود کی باتیں کیا کرے جس کو وہ بتا سکے کہ وہ محمود سے پیار کرتی ہے اور وہ بھی اس سے پیار کرتا ہے اور اسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور صرف اس کی صورت دیکھنے کھڑکی سے باہر ندی کے بل پر آیا کرتا ہے۔

نیلم سے بڑھ کر کوئی سہیلی اس قابل نہ ہو سکتی تھی جس کو نرگس اپنا ہمراز بنا سکے۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے کہ کل نیلم مری پہنچ رہی ہے نرگس کو بے حد خوشی ہوئی اور بے چینی سے دوسرے دن کا

نتظار کرنے لگی۔ نیلم کو ان کی کوشی میں ہی ٹھہرنا تھا وہ اسے اپنے کمرے میں ہی ٹھہرائے گی پھر وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھ کر رات گئے تک باتیں کرتی رہا کریں گی۔

باتیں جوانی کی رنگین باتیں محبت اور پہلی ملاقات کی باتیں!!
”نرگس خوشی سے جھوم گئی

اس نے خط کو درواز میں بند کیا اور کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔“

خوشی سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی سامنے ندی کے پل پر محمود کھڑا تھا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ نرگس بھی ذرا سا مسکرائی اور پھر فوراً ادھر ادھر دیکھنے لگی اسے ڈرتا کہیں انہیں کوئی دیکھ نہ لے اور محبت کا یہ پودا پھول لانے سے پہلے ہی زمین کے ساتھ نہ ملا دیا جائے۔ اگرچہ اس نے بڑے آزاد ماحول میں تعلیم حاصل کی تھی مگر اس کے والد صاحب ایسے معاملوں میں بڑے سخت گیر تھے اور نرگس اپنے باپ کی طبیعت سے خوب واقف تھی۔

اتنے میں محمود نے کاغذ کا ایک پرزہ جیب سے نکالا ایک چھوٹے سے پتھر کے گرد اچھی طرح لپیٹا دروازے سے نرگس کی کھڑکی کی طرف پھینک دیا پتھر کھڑکی کے قریب چھاڑیوں میں آ کر گرا۔

اس کے بعد محمود وہاں سے چلا گیا۔

نرگس فوراً دوسری طرف سے کھڑکی کے باہر آئی اور اس نے جلدی سے جھاڑیوں میں سے کاغذ پتھر سمیت اٹھا لیا۔ پتھر وہیں پھینک کر اس نے کاغذ دوپٹے میں چھپایا لیا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

یہ محبت کا پہلا خط تھا۔ یہ بہار کا پہلا سرخ پھول مسکرایا تھا۔ زگس نے کھڑکی بھی بند کر دی اندر اندھیرا ہو گیا اس نے ٹیبل لیمپ جلایا اور دھڑکتے ہوئے دل اور بے چین نگاہوں کے ساتھ محمود کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔

میری پیاری گمنام محبوبہ!

تمہیں پہلی بار محبوبہ کے مقدس نام سے مخاطب کر رہا ہوں معاف کر دینا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں میں نے تمہیں اس انمول نام سے یاد کرنے سے پہلے کئی بار سوچا کہ تمہیں پھر کون سے نام سے، کس القاب سے یاد کروں؟ لیکن کوئی بھی لقب اتنا پسند نہ آیا جتنا یہ پسند آیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں سچائی بھی سو فیصد ہے۔ تم میرے لیے بیش قیمت محبوبہ ہو اور میں تمہارا پجاری ہوں اندھا پجاری جو مرتے دم تک تمہاری پوجا کرتا رہے گا۔

میری بات کا اعتبار کرنا میری محبوبہ جب سے تمہیں دیکھا ہے دل بے قابو ہو رہا ہے۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب میں نے زندگی میں پہلی بار تمہیں ریل کے ڈبے میں سے سر نکالے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے چاند کھڑکی میں سے باہر کا نظارہ کر رہا ہے۔ بلکہ تمہارے حسن کے مقابلے میں چاند کی خوبصورتی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ میں شاعر نہیں ہوں وگرنہ یہاں پوری ایک نظم لکھ دیتا۔ تمہیں اس طرح دیکھ کر میرے دل پر، بلکہ ہوش و حواس پر ایک بجلی سی گری اور میں یوں ساکت سا ہو کر رہ گیا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ایک ایسی جگہ کیا ہو گیا ہے اور اسی عالم میں میں نے تمہیں سلام کر دیا۔ یہ فعل قطعاً بے اختیاری اور غیر شعوری تھا۔

اس کے بعد طلسم زدہ انسان کی طرح، پجاری کی طرح ہر شیش پر باہر نکل کر تمہیں دیکھ

لیتا۔ تمہارے درشن کر لیتا یہاں تک کہ ہم دونوں کی منزل مقصود آگئی۔

میں تمہیں دیکھنے کے لیے سب سے پہلے نیچے اترا۔ مگر وہاں بھیڑ اس قدر تھی کہ جلدی پلیٹ فارم پر نہ آسکا اور جب میں نیچے اترا تو میں نے دیکھا کہ تمہارے ارد گرد بہت سے لوگ ہیں اور تمہیں تمہارے رشتہ داروں نے اسی طرح گھیرے رکھا ہے جیسے ستارے چاند کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔

اس کے باوجود میں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر تمہاری ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ پھر شیش کے باہر ایک تنہا جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا، تاکہ آخری بار تمہارے نیاز حاصل کر سکوں، میرا خیال تھا کہ تم لوگ شاید کار میں نہ جاؤ گے لیکن جب باہر آ کر پتہ چلا کہ تم کار میں سوار ہو رہی ہو تو میں ذرا گھبرایا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اب کبھی تمہیں نہ دیکھ سکوں گا۔ اب کبھی تمہارا پتہ معلوم نہ کر سکوں گا۔ حالانکہ میں نے تمہارے مکمل تعاقب کا پروگرام بنایا تھا۔

لیکن فوراً ہی میں نے معاملہ حل کر لیا

جب تمہاری کاروں کا قافلہ شیش کے احاطے سے نکل کر بڑی سڑک پر روانہ ہوا تو میں نے بھی فوراً ایک ٹیکسی لی اور تمہارے پیچھے پیچھے چل پڑا جب تم لوگ مکاف روڈ پر ایک خوبصورت بنگلے میں داخل ہو گئے تو میں نے کار وہاں سے گھمائی اور اپنے دوست کے ہاں چلا گیا۔

رات کو میں کھانے کے بعد اکیلا ہی اس طرف سیر کرنے نکل آیا۔ میں نے مصلحتاً اپنے دوست کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے کوشی کے باہر نام کی ختی اور نمبر پڑھا اُسے نوٹ بک میں اپنی یادداشت کے لیے لکھا اور وہاں سے واپس آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ تم لوگ اپنے رشتہ دار کے ہاں سیر کرنے لاہور سے آئے ہو اور چند روز

یہاں ٹھہر کر واپس چلے جاؤ گے۔ چنانچہ میں نے ساری رات تم سے کسی نہ کسی طرح ملاقات کرنے کے مسئلہ پر سوچ بچار کرتے ہوئے بسر کر دی۔ دوسرے روز میں ۱۲ بجے دوپہر تک سویا رہا۔ کھانا کھا کر میں گھر سے باہر نکلا اور تمہاری کوشی کی طرف چل پڑا۔

یہاں آیا تو لان میں کوئی آدمی نہ تھا میں نے یونہی سڑک کے دو تین چکر کاٹے اور پھر ایک مالی کو پاس بلا کر پوچھا

”کیوں بابا؟ یہاں لاہور سے کچھ مہمان

آئے ہیں کیا؟“

میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب وہ کہے گا کہ ہاں آئے ہوئے ہیں تجھے کیا کام ہے؟ تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر یا یہ کہہ کر کہ مجھے کسی دوسری کوشی کا نمبر درکار ہے۔ غلطی سے اس کوشی میں آ گیا، وہاں سے پیچھا چھڑالوں گا۔ لیکن مالی نے کہا

جی ہاں بابو جی مگر وہ لوگ تو ایک ہفتہ ہو مری چلے گئے“

میں ذرا حیران ہوا

”اچھا؟“

مالی کہنے لگا

بابو جی اگر کوئی کام ہو تو اندر اطلاع کر دوں؟ میں نے جلدی سے کہا

کوئی ضرورت نہیں بابا جی میں بھی کوہ مری جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر ان سے مل لوں گا“

حالانکہ میرا کوئی ارادہ کوہ مری آنے کا نہ تھا۔ میرا پروگرام وہاں سے اپنے دوست کو

ساتھ لے کر ایبٹ آباد جانے کا تھا، جہاں ایک اپنا خوبصورت گھر ہے۔ جو اس مقصد کے لیے والد

صاحب نے بنوا رکھا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دگرگوں تھا۔ سارا کھیل چو پٹ ہو گیا تھا۔

”اب کیا کیا جائے“

چنانچہ میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ ایبٹ آباد کی بجائے کوہ مری چلا جائے پس بغیر مزید کچھ سوچنے یا غور کرنے کے میں نے وہاں سے سیدھا بس اسٹینڈ کا رخ کیا اور تیسرے پہرے کوہ مری پہنچ گیا شام سے لے کر رات گئے تک میں نے ہر سڑک، ہر ہوٹل، ہر کیفے میں تمہاری صورت کو تلاش کیا مگر تم کہیں دکھائی نہ دیں۔ وہاں میرے چند ایک رشتہ دار بھی مل گئے جن سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا، مگر میں نے کسی کی پروا نہ کی اور تمہیں برابر تلاش کرتا رہا۔

آخر ایک دن تھک ہار کر پنڈی پوائنٹ والی سڑک پر جھنگے پر بیٹھا تھا کہ سامنے سے تمہیں آتے دیکھا۔ دل خوشی سے اچھل پڑا میری اتنی قسمت کہاں کہ تمہیں اپنے قریب سے ایک شاندار ملکہ کی طرح گزرتے ہوئے دیکھوں۔ دل دھڑکنے لگا۔ مگر میں نے اسے سمجھایا کہ ننگے ایسی ایک چیز کو دیکھنے کے لیے تو کئی روز سے تڑپ رہا تھا اب جب تیرا محبوب سامنے ہے تو پریشان ہو رہا ہے؟ بے تاب ہو رہا ہے؟ اب آنکھیں کھول کر حسن حقیقی کا تماشا کر۔

چنانچہ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ میں تمہارا تعاقب کرتا اور تمہارے مکان کا محل وقوع دریافت کرتا۔

جب میں نے تمہارا مکان دیکھ لیا تو ایک پرسکون اور محفوظ جگہ تلاش کرنے کے بعد میں نے وہاں ہر روز جا کر بیٹھ رہنا اور تمہارا دیدار کرنا اپنا معمول بنالیا لیکن دل میں حسرت ملاقات ابھی تک چل رہی تھی، لیکن ملاقات ہونی بڑی مشکل بات تھی۔ اگر ہو بھی تو کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ اس کے باوجود دل پر

امید تھا۔ میں بڑا صابر اور مستقل مزاج نوجوان ہوں۔ اللہ کے کرم سے کبھی ناامید نہیں ہوا۔

نیت ٹھیک رکھتے ہوئے خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے میرے دکھی دل کی فریاد بھی سن لی تمہیں وہ بارش میں بھیگی ہوئی ملاقات تو خوب یاد ہو گی؟

کاش! وہ وقت کبھی نہ گزرتا!

کاش! وہ لمحے وقت کی چادر میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائیں اور ہم جب چاہیں انہیں کھول کر دیکھ لیا کریں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وقت کا دریا ہمیشہ آگے ہی آگے بہتا چلا جاتا ہے وہ کبھی نہیں رکتا۔

”وہ کسی کے لیے نہیں رکتا۔“

بہر حال تم سے ایک عجیب اتفاق سے ملاقات ہوئی۔ میں اس حسین ترین ملاقات کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس دن میں نے بارش کی موسیقی میں تمہاری دلنشین آواز سنی تمہاری نیلی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم سے باتیں بھی کیں اور یہ معلوم کیا کہ تم بھی مجھے اچھا سمجھتی ہو۔ یہ بات جان کر مجھے جس قدر خوشی اور فخر حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

میری گناہ محبوبہ! اب میری حالت رحم کے قابل ہے۔ میرے دل کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ وہ بار بار تمہیں دیکھنے، تمہاری باتیں سننے اور تمہاری نیلی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکنے کو مجل رہا ہے جس طرح بھی ہو سکے مجھے کہیں ملو، ضرور ملو۔ ورنہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ میں کل شام کو بل پر اس خط کا جواب لینے آؤں گا اس وقت ذرا اندھیرا ہوگا۔ تم اس خط کا جواب اسی طرح پتھر میں

لیٹ کر ندی والی جھاڑیوں کی طرف پھینک دینا۔ میں وہاں آ کر اٹھالوں گا اور کسی کو شک نہیں پڑے گا کیونکہ اس کے بعد میں فوراً وہاں منہ دھونا شروع کر دوں گا لیکن خدا کے لیے ملاقات کا وقت ضرور لکھنا اور وہاں اپنا پیارا نام ضرور لکھنا۔ خیر میں ملنے پر تم سے ضرور پوچھوں گا۔ تمہارا نام مجھے یقین ہے کہ تمہاری ہی طرح خوبصورت اور انوکھا ہوگا۔

”صرف تمہارا

محمود“

خط پڑھنے کے بعد نرگس پر ایک نشے کی سی حالت طاری ہو گئی

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کی پشت سے سر لگا دیا۔ محمود نے اس قدر رومانی اور محبت کے جذبات سے چھلکتا ہوا خط لکھا تھا کہ نرگس بے خودی ہو کر رہ گئی۔ اتنے میں باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ نرگس ایک دم چوکنی ہو گئی اس نے جلدی سے خط میز کی دراز میں رکھا اور ٹیبل لیپ بجا کر کھڑکی کھول دی۔ دروازہ کھلا اور سلمان اندر داخل ہوا۔

”نگو بے بی، تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ کل چچی جان آرہی ہیں غالباً نیلی نے تمہیں یہی لکھا ہوگا۔“

جی ہاں بھائی جان نیلی نے مجھے لکھا ہے کہ وہ لوگ کل یہاں پہنچ رہے ہیں

خوب! تو پھر صبح اڑے پر چلنا ہوگا۔ اب تو خوب رونق ہی رونق ہو جائے گی اور تمہارا جی

بھی لگ جائے گا۔

نرگس ہنسنے لگی۔

تو کیا اب نہیں لگ رہا؟“

سلمان مسکرایا۔

”بھئی نیلی تمہاری سہیلی جو ہوئی۔ پھر تم اکٹھے سیریں کیا کرنا۔ خوب مزار ہے گا۔“

زرگس نے جلد سے کہا

لیکن بھائی جان آپ تو ہمیں سینما بھی نہیں دکھاتے ابا جان سے تو ہم کہنے سے رہے اگر

آپ بھی“

سلمان ہنسنے لگا۔

”اری پگلی! ابھی تو پرسوں سیروز میں فلم دیکھنے گئے تھے۔“

زرگس بولی

”ہاں مگر آج پھر جانے کو دل چاہتا ہے۔“

”اچھا تو پھر دوسرے شو چلیں گے۔ اس لیے کہ شام کو مجھے ایک کاروباری میٹنگ میں جانا

ہے شام کو پھر تیار رہنا۔ میں تمہاری بھابی کو بھی کہہ دیتا ہوں۔ اب تو خوش ہونا؟“

”بہت“

زرگس نے ہنستے ہوئے کہا۔ سلمان نے پیار سے زرگس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے

باہر نکل گیا۔ اصل میں زرگس آج بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ شام کو سینما دیکھ کر اس خوشی کو دوبالا کرے

اس کے بعد اُس نے فوراً محمود کا خط دراز میں سے نکالا۔ اُسے ایک بار پھر پڑھا، چوما۔ سادہ لفافے

میں بند کیا۔ اپنے صندوق میں سب سے نیچے کپڑوں کی تہہ میں چھپیا کر رکھا۔ صندوق کا تالا لگایا اور

گنگنائی ہوئی باہر نکل گئی۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب نیلم اور اس کی امی آگئیں

یہ سب لوگ انھیں لینے بس کے اڈے پر گئے ہوئے تھے۔ نیلم، زرگس کو مل کر بہت خوش

ہوئی۔ زرگس کو بھی کچھ کم مسرت نہ ہوئی تھی۔ اُسے مری نہ صرف یہ کہ ایک سہیلی ملی گئی تھی بلکہ ایک ہم

راز بھی مل گئی تھی۔ نیلم کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی تھا۔ گھر پہنچ کر مہمانوں نے غسل وغیرہ سے

فارغ ہو کر چائے پی نیلم نے ناشتہ بھی کیا۔ کیونکہ جب وہ گھر سے چلی تھی تو اس کو زرگس سے ملنے کی

اس قدر خوشی تھی کہ اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ چنانچہ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔

زرگس نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر زبردست ناشتہ کروایا

”خوب ڈٹ کر کھانا۔ تمہیں ایک زبردست خوشخبری سنانی ہے“

”نیلم کھاتے ہوئے رُک گئی۔“

”کوئی خوشخبری بھلا؟“

”تم ناشتے سے تو فارغ ہو لو“

”نیلم ضد کرنے لگی۔“

”بھئی نہیں ابھی بتاؤ۔ اسی وقت بتاؤ۔“

زرگس نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی

”آہستہ بولو آہستہ نیلی! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں“

نیلیم حیرانی سے بولی

”آخرا یہی بھی کوئی بات ہے“

نرگس کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی بولی

بس ایک بات ہے

نیلیم کچھ اور پوچھنے ہی والی تھی کہ دروازے کا پردہ ایک طرف ہٹا اور اس کا بڑا بھائی اندر داخل ہوا۔ اس نے نرگس کا مختصر سے سجے ہوئے کمرے کے ارد گرد نگاہ دوڑائی اور کہنے لگا۔

”ارے! اس لگو نے تو اپنا کمرہ خوب سجا رکھا ہے۔“

”کیوں بھی یہاں ساری عمر رہنے کا ارادہ ہے؟“

نرگس نے دل میں کہا۔ کاش! میں ساری عمر یہاں رہ سکتی۔ یہاں عمر بھر رہنا بھلا

کہاں نصیب ہوگا۔ یہاں عمر بھر کون رہنے دے گا؟“

”پھر اپنے چچا زاد بھائی سے یوں ہم کلام ہوئی“

جی نہیں عمر بھر تو نہیں رہنا، مگر ڈیڑھ ایک مہینہ تو ٹھہریں گے ہی۔ آپ بھی تو ہمارے ساتھ

ہی رہیں گے نا“

”بھئی ہم تو ایک ہفتے بعد چلے جائیں گے۔“

نرگس نے بڑی بے چینی سے نیلیم کی طرف دیکھا

”وہ کیوں؟ ایک ہفتہ تو بڑی تھوڑی مدت ہے۔ کم از کم پندرہ دن تو ٹھہریں

”اور پیچھے جو کاروبار چھوڑ کر آئے ہیں اسے کون سنبھالے گا۔“

تو پھر آپ نیلیم کو ہمارے پاس چھوڑ جائیں۔ اسے وہاں جا کر تو کچھ بھی نہیں کرنا۔ کالج میں

چھٹیاں ہو ہی چکی ہیں“

نیلیم کا بڑا بھائی ہنس پڑا اور نیلیم کی طرف دیکھ کر بولا

اس سے ہی پوچھ لو۔ اگر اس کی مرضی ہے تو بے شک ٹھہر جائے“

نرگس نے نیلیم کی طرف بڑی محبت سے تکتے ہوئے کہا

کیوں نیلی! تم ہمارے پاس ٹھہرو گی نا؟ تم تو ان کے ساتھ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گی نا؟“

”نیلیم مسکراتے لگی“

”میرا جو جی چاہتا ہے کہ ساری عمر یہاں رہوں، مگر امی جان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ نہ

مانیں تو مجبوراً مجھے بھی ان کے ساتھ ہی واپس جانا پڑے گا““

انہیں میں منالوں گی

پھر میں تمہارے پاس رہوں گی

”بہت خوب! تو پھر میں چلتا ہوں۔ خدا کرے تم لوگ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکو“

نرگس نے دل میں کہا، ضرور کامیاب ہوں گے۔ ضرورت کامیاب ہوں گے۔ مگر اس کے

نزدیک ”ارادوں“ کا مفہوم کچھ اور ہی تھا۔

نیلیم کا بھائی باہر چلا گیا۔ اب وہ دونوں چچا زاد بہنیں یا سہیلیاں اس چھوٹے سے کمرے

میں تنہا رہ گئیں۔ نرگس نے نیلی سے پھٹتے ہوئے کہا

تم فکر نہ کرو میں چچی جان کو منالوں گی وہ میری بات ضرور مان جائیں گی۔“

نیلیم نے کہا

محبت کی داستان کے بارے میں ایک لفظ بھی معلوم نہ تھا۔ اس کے علاوہ پھر وقت بھی نہ تھا کہ زنگس اسے اتنی جلدی سب کچھ بتا سکے۔

چنانچہ زرگس نے فیصلہ کیا کہ وہ محمود کو لکھ دے گی کہ ملاقات پھر کبھی ہوگی۔ ابھی گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر جب سب لوگ بڑے کمرے میں بیٹھے تھے، اپنے کمرے میں جا کر جلدی جلدی یہ سطر لکھیں۔

مجھے افسوس ہے کہ ابھی وہ بات نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب کل شام کو اسی وقت مل جائے گا۔“

بس صرف یہی چند الفاظ لکھے اور کاغذ کو ایک پتھر کے گرد لپیٹ کر میز کی دراز میں رکھ دیا اور بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگی۔ ابھی کوہ مری کی وادی پر شام کے سائے پوری طرح نہ پھیلے تھے کہ محمود نے گلے میں زرد رومال لگا کر کوٹ پہنا اور ندی کے پل جا کر بیٹھ گیا نیچے والی کوٹھی کی وہ کھڑکی جس کا پٹ ندی کے پل کی طرف کھلتا تھا بند تھی۔

محمود بڑی بے چینی سے اپنی محبوبہ کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنے اوپر رد میو ہونے کا گمان ہوا جو جیولٹ کی بالکونی کے نیچے کھڑا اس کی صورت دیکھنے کو ترس رہا ہو۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی بے تابیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

آخر کسی نے آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ محمود نے اپنی محبوبہ کو فوراً پہچان لیا۔

نرگس نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر سامنے پل پر بیٹھے ہوئے محمود کو دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تو جلدی سے ایک ہاتھ

”اچھا گنو! وہ خوشخبری تو سناؤ“

اری اتنی جلدی کیا ہے؟“

بھئی خدا کے لیے اب خواہ مخواہ دیر نہ کرو۔ جو بات کہنی ہے کہہ بھی دونا؟“

ذرا ٹھہرو ، ذرا ٹھہرو

نرگس نے اتنا کہہ کر دو رازے کے پاس جا کر باہر جھانک کر دیکھا اور جب اس کی تسلی ہو گئی کہ وہاں کوئی نہیں تو اس نے نیلم کے قریب آ کر اس کے کان میں کہا

رات کو سناؤں گی۔ رات تم میرے کمرے میں سونا

* * * * *

نرگس نیلم کو بہت جلد وہ راز بتا دینا چاہتی تھی جو اس کے دل میں باہر نکلنے کے لیے برقرار ہو رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ وہ بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ، نیلم کو ایک ایک لفظ سنانا چاہتی تھی۔ وہ الف سے لے کر یے تک اپنی پہلی محبت کی روداد بڑے سکون اور مزے سے بیان کرنا چاہتی تھی۔ ایک ایسے لمحے جب وقت خاموش ہو، رات چپ ہو، وقت رُک گیا ہو، کوئی پرندہ بھی کہیں پر نہ مار رہا ہو۔

اس مقصد کے لیے اس نے رات کا وقت چن لیا تھا

لیکن اس سے پہلے محمود کو اُس کے خط کا جواب بھی لکھنا تھا۔ اس نے ملاقات کے لیے وقت بھی دینا تھا اور یہ سب کچھ اگر نیلم کے مشورے سے ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ لیکن ابھی تک نیلم کو اس

باہر نکال کر پتھر میں لپٹا ہوا خط سامنے والی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی نرگس نے جلد سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

پہلا پھول

رات کے کھانے کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور بڑے کمرے کی بتیاں گل کر دی گئیں تو نرگس اور نیلم بھی اس چھوٹے سے کمرے میں آ گئے جس کی کھڑکی ندی کی طرف کھلتی تھی۔

یہاں پہنچ کر نرگس نے دروازہ بند کر دیا۔ بتی جلائی اور وہ دونوں پلنگ پر گرم شالیں اور گھٹنوں تک لمبا اور ڈھ کر بیٹھ گئیں۔ نیلم نے بڑی بے صبری سے کہا

محمود نے ایک بل کے لیے توقف کیا اور پھر جلدی سے بڑے بڑے پتھر کو الٹا پھلانگتا نیچے جا کر خاص جھاڑی کے پاس پہنچا۔ پتھر اٹھا کر جیب میں ڈالا اور واپس اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر سڑک پر جا کر اس نے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر نرگس کے رقعے کو کئی بار پڑھا۔ اُسے پیار سے چوما۔ جیب میں ڈالا اور دوسرے دن شام کے انتظار میں سگریٹ سلگا کر ہوٹل کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆☆

”لو اب جلدی سے وہ خوشخبری سنا دو اب زیادہ انتظار نہ کرو“

نرگس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور بڑی سرگوشیوں والی آواز میں اپنی داستان محبت شروع کر دی پہلے پہل تو وہ شرماتا کر اور ذرا جھجک جھجک کر بیان کرتی رہی لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی اس کی جھجک دور ہوتی گئی۔

اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہے اس کے سامنے کوئی بھی نہیں بیٹھا۔ بلکہ وہ کمرے میں اکیلی ہے اور محبت کی ازلی اور ابدی زبان میں خود سے ہم کلام ہے۔

جب وہ نیلم کو سب کچھ سنا چکی تو سب سے آخر میں اس نے نیلم کو محمود کا پہلا محبت نامہ یعنی وہ خط دکھلایا جو اسے ایک روز پہلے موصول ہوا تھا۔ نیلم اس خط کو لے کر بڑے غور سے پڑھنے لگی۔

جب وہ اسے پوار پڑھ چکی تو اس نے ایک لمبا سانس لیا اور زگس کی طرف دیکھ کر مسکرائے گی۔

”وہ خوشخبری تھی جسے سنانے کے لیے تو بے قرار تھی۔“

”زگس نے تنک کر کہا“

”تو بھی تو سننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ آخر تجھے نہ سنا تو پھر کسے سنا تو اپنے جی کا بوجھ بھی تو ہلکا کرنا تھا۔“

زگس نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا

اب تو دل اس طرح ہو گیا ہے جیسے دھوپ میں کنول کا پھول مسکرا رہا ہو۔“

”نیلیم نے کہا“

یہ شاعری تمہیں اسی محمود نے سکھلا دی ہے شاید؟ ابھی تو ابتدائے عشق ہے نہ جانے تمہیں کیا کچھ نہیں سیکھنا پڑے گا۔ زگس نے محمود کا خط تہہ کر کے اسی طرح صندوق میں بند کر کے تالا لگا دیا اور خود نیلیم کے پاس لحاف میں آکر بیٹھ گئی۔

”اب بتاؤ نیلی! میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟“

”نیلیم نے اپنی سہیلی کی طرف بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا“

”میری بہن! غلطی کا سوال اب پیدا ہوگا۔ ابھی تک تو تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ٹھیک ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ تم اب کیا کرو گی؟ کیا تم اپنے آپ کو اس انوکھے اور خطرناک دریا میں بہا دو گی

کنارے پر بیٹھ کر اس کی لہروں کا تماشا کرو گی۔“

”زگس بولی“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ ذرا کھول کر بتاؤ۔“

”نیلیم نے کہا“

”میرا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسے لڑکے نے تم سے اظہار محبت کیا ہے جو اتفاق سے تمہیں پسند ہے جب تم محبت کرنے لگی ہو مگر ابھی تک تم نے اس سے اظہار محبت نہیں کیا تمہیں شاید علم نہیں کہ مرد فطرتاً متلون مزاج ہوتے ہیں وہ ایک جزیرے کی جانب صرف اتنی دیر تک کھینچے چلے آتے ہیں جب تک کہ وہ دریافت نہیں ہوتا۔ جب وہ دریافت ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس لیے میں تمہیں یہی کہوں گی کہ ابھی دریافت مت ہونا۔“

زگس اگرچہ پڑھی لکھی لڑکی تھی مگر محبت کے معاملات میں وہ بالکل ان پڑھ تھی۔ اس کے مقابلے میں نیلیم کو ایک محبت کی ناکامی کا اچھا خاصا تجربہ تھا اور اس کا زگس کو بھی علم تھا۔ کچھ اس خیال سے بھی اس نے نیلیم کو اپنا ہمراز بنایا تھا کہ وہ اسے اپنے تجربات سے فائدہ پہنچائے گی اور اسے راستے کے نشیب و فراز سے قبل از وقت آگاہ کر دے گی۔

اس نے نیلی کی لمبی تقریر سن کر کہا

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے اظہار محبت نہ کروں؟“

”نہیں! میرا مطلب یہ نہیں“

”پھر“

میں تمہیں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ سامنے آنے کے باوجود اپنے آپ کو چھپا کر رکھو۔ اپنا سب

کچھ ظاہر کرنے کے باوجود ایک ہیو ایسا ضرور رکھو جو چھپا ہوا ہو اور جس میں محمود کے لیے بڑی کشش ہو۔ میری بات کو پتھر پر لکیر سمجھو کہ مرد پر اسرار عورت پر جان دیتا ہے۔

تو پھر میں پر اسرار بن جاؤں

بالکل سر سے لے کر پاؤں تک پُر اسرار بن جاؤ

”مگر کیسے؟ کیوں کہ میں اس فن سے واقف نہیں ہوں“

نیلیم ہنسنے لگی۔

”اری بھلا اس میں سیکھنے کی کوئی بات ہے؟ بس وہ تم سے جو بات بھی پوچھے اسے گول کر

جاؤ اس کی پوری پوری وضاحت نہ کرو۔ اس کے متعلق تھوڑا سا بتاؤ اور باقی جو زیادہ ہو اسے چھپا جاؤ“

نرگس کچھ الجھتی گئی۔

بھئی یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ فرض کرو اگر ایسا ہو گیا کہ جو زیادہ حصہ چھپانے والا ہوا اُسے

میں نے ظاہر کر دیا اور جو ظاہر کرنے والا ہوا اسے چھپا دیا تو؟“

نیلیم ہنس پڑی۔

اری تو نے تو بی اے کر کے گنوا دیا۔ کہاں ہے تیری ڈگری۔ لا میں اسے چولہے میں

ڈالوں۔ پگلی اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتی؟

مگر بی اے میں ایسی باتیں تو نہیں سکھائی جاتیں نہ سہی پر کالج میں تو لڑکی ہوشیار ہو

جاتی ہے“

”پھر ایسے کالج ہوشیار پور میں ہوں گے۔ لاہور میں تو نہیں۔“

”نیلیم نے طنز یہ انداز میں کہا“

”چلو چھوڑو لاہور میں زیادہ ہیں“

”نرگس ضد کرنے لگی“

”اللہ ایسی باتیں چھوڑو اور مجھے کوئی کام کی بات بتاؤ۔“

”تمہیں بتا تو رہی ہوں مگر تم سنتی ہی نہیں“

”مگر نیلی! میں پر اسرار نہ بن سکوں گی“

”تو پھر ایسا کرو کہ ابھی اسے مت ملو“

”یہ تو نہ ہو سکے گا۔“

”کہنے کو تو نرگس یہ کہہ گئی مگر ساتھ ہی شرم سے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا“

”نیلیم نے کہا“

اچھا جی! ابھی سے یہ تیور! ابھی سے یہ حال! تو اپنی لٹیا ڈبوئے گی۔ تو ضرور پر اسرار بنے گی“

نرگس نے نیلیم کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ نیلیم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر

رہے تھے اور وہ رونے ہی والی تھی نیلیم کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے نرگس کو اپنے گلے سے لگا

کر اس پیشانی چوم لی۔

اری یہ کیا؟ اتنی سی بات پر آنسو کیوں آگئے۔ میری پیاری نرگس کیوں روئے؟ روئیں

اس کے دشمن۔ نہیں میری نگو! تو بے شک اس سے محبت کر مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکا شریف ہے مجھے

اس کا خط پڑھ کر یہی اندازہ ہوا ہے۔ اس کے خط میں اس کے دل کی سادگی اور خلوص جھلک رہا ہے۔

مجھے یہ لڑکا بڑا کھرا اور سچا معلوم ہوتا ہے۔ تم اس سے ضرور محبت کرو اور بے شک اس سے ملاقات

کرو۔ میں تمہاری سچی خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے صرف اتنا کہوں گی کہ کسی معاملے میں بھی

اعتدال کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا۔ اس سے اظہارِ محبت ضرور کرو، مگر ایک خاص حد تک اس سے ضرور ملو۔ مگر ایک خاص حد کو مد نظر رکھتے ہوئے بس نرگس کو اس سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو ایک دم خشک ہو گئے اس نے خوشی سے نیلم کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔

تم نہیں جانتیں نیلی! مجھے اس سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔ میں اسے اپنے دل کا دیوتا تسلیم کر چکی ہوں۔ وہ بڑا پیارا، بڑا شریف، بڑا مہذب اور بڑا سچا لڑکا ہے۔ اگر تم اسے دیکھ لو اور پھر اس سے کچھ وقت باتیں کر لو تو تم میرے خیال کی تائید کرو گی۔ ضرور تائید کرو گی۔“

نیلم نے آہستہ سے کہا

”خدا کرے کہ وہ اس سے بہتر ثابت ہو۔ لیکن یہ سب کچھ وہ آج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کل کیا ہوتا ہے“

نرگس نے جیسے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

وہ کل بھی ایسا ہی ثابت ہوگا بلکہ وقت آنے پر اس سے بھی بہتر اور سہ گنا زیادہ اچھا ثابت ہوگا۔ میرا اس بات پر ایمان ہے۔

”ان باتوں پر میرا بھی ایمان ہوا کرتا تھا۔“

نیلم نے کہا اس کی آواز میں گہرائی اور درد کا تاثر تھا۔

تم ظفر کو بھولی نہیں ہو گی۔ میں اسے نہیں بھول سکی

وہ مجھے یاد ہے، خوب یاد ہے۔ بڑی اچھی طرح یاد ہے۔ تم ہم دونوں کی ایک ایک بات جانتی ہو۔ جس طرح تم نے مجھ پر بڑے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنا راز افشا کر دیا ہے اسی طرح

میں نے بھی تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ میں نے اپنے رومان کی ایک ایک بات تمہیں بتادی تھی، لیکن ایک بات تم سے چھپا گئی تھی۔“

وہ کوئی بات تھی نیلی؟“ نرگس نے جلدی سے پوچھا

”میں نے تم سے کہا تھا کہ ظفر کو میں نے چھوڑ دیا ہے

میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی، اس لیے کہ میرے ماں باپ اس کام کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن یہ میں نے زندگی کا بہت بڑا جھوٹ بولا تھا۔ حقیقت کچھ اور ہی تھی۔“

وہ کیا تھی؟“ نرگس بے تاب ہو گئی۔ نیلم نے پر آب نگاہوں سے نرگس کو دیکھا۔

حقیقت یہ تھی کہ ظفر مجھے چھوڑ گیا تھا“

کیا واقعی؟ نرگس کے ہونٹوں سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

ہاں نرگس! ظفر نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی

مگر کیوں؟ وہ تو بڑا اچھا لڑکا تھا“

اچھائی اور برائی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ایک کو دوسری کی جگہ لینے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں تمہیں خود کہا کرتی تھی کہ ظفر بڑا پیارا لڑکا ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، بے حد کرتا ہے اور ہمیشہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ مجھ سے کبھی جدا نہیں ہونا چاہتا اور نرگس! اس نے مجھے یقین بھی دلایا تھا کہ وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوگا۔ انہی باتوں سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس نے واقعی میرے ساتھ بڑی وفا شکاری سے کام لیا تھا۔ میری ہر طرح دلجوئی کی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کیا کرتا تھا۔ بڑا پیارا جتایا کرتا تھا۔

مگر افسوس کہ وہ سب کچھ سراب ثابت ہوا۔ جب وقت آیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ایک بھونرا تھا۔ جو کلی سے صرف اسی وقت کے لیے محبت کی پیٹنگیں بڑھا رہا تھا جب تک اس میں رس باقی تھا۔ جب رس ختم ہو گیا تو اس نے اڑنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں کی۔“

زرگس بڑی حیران ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ اسے نیلم نے یہی کہا تھا کہ ظفر کو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔ کبھی ان دونوں کا آپس میں بڑا پیار ہوا کرتا تھا۔ اس نے کبھی نیلم اور ظفر کے درمیان وہی رول ادا کیا تھا جو اب اس کے اور محمود کے درمیان نیلم ادا کرنے والی تھی۔ نیلم نے ظفر سے بے پناہ محبت کی تھی اور زرگس کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ظفر کو چھوڑ دینے کے بعد کس بُری طرح روتی رہا کرتی تھی۔ اس نے کئی دنوں تک سوائے پانی کے اور کچھ نہ کھایا پیا تھا۔ اور اب اس کی زبانی یہ نیا انکشاف سن کر اپنا رومان بالکل بھول گئی تھی۔

مگر نیلی! وہ تمہیں چھوڑ کیوں گیا؟ کیا تم خوبصورت نہیں ہو، اور پھر روپے پیسے کی بھی مالک ہو۔ اسے یہ تو بخوبی علم تھا کہ تمہارے نام بینک میں روپیہ جمع ہے۔“

نیلم نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

وہ اس نے میری مرضی سے آدھے سے زیادہ نکلویا تھا“

ہائیں! یہ کیسے۔۔۔۔۔؟ زرگس حیران رہ گئی۔

نیلم نے جلدی سے کہا

ان باتوں کو چھوڑ و زرگس۔ یہ پرانے قصے ہیں۔ انھیں فضول دہرانے سے کوئی فائدہ

نہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا کہ پرانے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتی تھی

کہ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ گھڑی میں کچھ ہوتے ہیں اور گھڑی میں کچھ ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی ظفر پر اسی طرح اعتماد کیا تھا جس طرح آج تم محمود پر کر رہی ہو۔ لیکن اس نے مجھ سے دھوکا کیا اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے یہی غلطی کی تھی کہ اس پر اپنے دل کا ہر کونہ نمایاں کر دیا تھا۔ اس سے اپنا کوئی بھی راز نہ چھپایا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ مجھے سے سیر ہو چکا ہے تو مجھے دھتکار کر چل دیا۔

میں تمہیں یہی کہتی ہوں کہ تم بھی کہیں یہی غلطی نہ کر بیٹھو اور بعد میں تمہیں بھی میری طرح پچھتانا پڑے اور کونوں میں خچپ چھپ کر رونا پڑے۔“

زرگس نے گہری محویت سے چونکتے ہوئے کہا

”نہیں نیلی! میں ایسی غلطی نہ کروں گی۔ میں ہر لحاظ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھوں گی۔ ہر طرح سے اپنی شخصیت کی حفاظت کروں گی۔ تم بے فکر رہو۔“

”نیلم نے کہا“

مصیبت یہ ہے کہ ہر لڑکی ایسا ہی کہتی ہے۔ ایسے ہی عزائم سینے میں لے کر سفر کا آغاز کرتی ہے لیکن ذرا آگے جا کر سب کچھ فراموش کر دیتی ہے پھر نہ وہ ارادے باقی رہتے ہیں اور نہ ان عزائم کا نشان ملتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم بھی ایسی ٹریجڈی کا شکار نہ ہو جاؤ۔“

نہیں نیلی! ایسا کبھی نہ ہوگا۔ تم بے شک دیکھ لینا۔“

اچھا دیکھ لوں گی۔ تم دونوں بھی یہیں ہو۔ میں بھی یہیں ہوں۔“

زرگس نے فوراً پہلو بدلا

مگر مصیبت یہ ہے کہ اب کہاں ملا جائے۔ کل اسے کیا جواب دوں؟“

پھر فوراً ہی جیسے کسی خیال کے ساتھ ہی شگفتہ سی ہو کر بولی

تم بھی ساتھ ہی چلو نیلی۔ بڑا مزہ آئے گا۔

کہاں ساتھ چلوں؟

محمود سے ملنے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں اکٹھی اسے ملیں۔ اس طرح میری

جھجک بھی دور ہو جائے گی، تم بھی اسے دیکھ لو گی اور ملاقات بھی ہو جائے گی۔ کہو کیسا خیال ہے؟

”نیلیم نے کہا“

بھی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں بلکہ میں تو اسے ملنا بھی چاہتی ہوں تاکہ تمہاری پسند کی داد

دے سکوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ تم دونوں کو کہیں برا نہ لگے۔

نرگس نے پوچھا

وہ کیوں؟

نیلیم شرارتی نظروں سے گھورتی ہوئی بولی

وہ اس لیے کہ جب دو محبت کرنے والے ایک جگہ بیٹھ کر پیار کی باتیں کر رہے ہوں تو کسی

دوسرے کے درمیان میں نہیں ہونا چاہیے۔

نرگس شرما سی گئی۔

چل ہٹ شریر کہیں کی۔ میں اپنی مصیبت کے مارے تجھے ساتھ لیے جا رہی ہوں اور تجھے

مذاق سو جھ رہا ہے۔

اچھا تو پھر چلی چلوں گی مگر آخر اسے کہاں ملا جائے؟

”یہی تو میں تم سے پوچھنے والی تھی۔“

میرا خیال ہے ذرا دماغ پر زور دے کر غور کیا جائے۔

”ضرور“

اب دونوں نے سر جھکا کر منہ لٹکا کر غور کرنا شروع کر دیا۔ نرگس بھی سوچ رہی تھی اور نیلیم

بھی غور کر رہی تھی۔ یکا یک نیلیم کو کچھ سوچ بھ گیا۔ فوراً نرگس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی

”گریٹ آئیڈیا؟“

کیا؟ کیا؟ نرگس نے جلدی جلدی پوچھا۔

یہ کہ ملاقات سمیز ہوٹل میں ہوگی۔

نرگس حیران رہ گئی۔

پاگل ہو گئی ہو کیا۔ وہاں اگر کسی نے دیکھا لیا تو معلوم ہے کیسی قیامت ٹوٹ پڑے

گی۔

نیلیم نے بڑے اطمینان سے کہا

پہلے میری بات تو سن لو۔ جانتی ہو اگر کسی نے ہمیں سمیز ہوٹل کے باہر دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔

کیا پھر وہ یہ نہیں کہے گا کہ ہم نے ملاقات کے لیے پہلے ہی سے وقت طے کر رکھا تھا؟ پاگل! ہوٹل

میں ملاقات اس لیے ہوگی کہ وہاں کسی کو شک نہ پڑ سکے گا۔ اگر کسی نے ہمیں اکٹھے دیکھ بھی لیا تو میں

کہہ دوں گی کہ میرا کلاس فیلو تھا اور پس تم جانتی ہی ہو ایسے معاملوں میں مجھے کبھی کسی نے کچھ نہیں

کہا۔ پھر کیا ہے؟ سب ٹھیک ہو جائے گا بڑے مزے سے وہاں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑائیں گے

اور باتیں بھی کریں گے۔ کیوں کیا خیال ہے؟

نرگس بولی

سوچ لو۔ کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔

واپس چل پڑا۔ کتنی دیر تک وہ دونوں اسے سڑک پر سے گزرتا دیکھتی رہیں۔ جب وہ سڑک کا موڑ گھوم گیا تو دونوں ایک دوسری کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ نیلم نے نرگس کی پیشانی چوم کر کہا۔

”خدا تجھے نظر بد سے بچائے۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں ساری زندگی ایک ساتھ بسر کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس کام میں میں اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گی۔“

نرگس کی آنکھوں میں آنسو آگئے نیلم نے اسے گلے سے لگالیا۔

اگلے روز شام نرگس بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

چار بجنے سے ہی اس نے چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوپہر ہی کو نیلم نے اس کے لیے گھر میں زمین ہموار کر دی تھی۔ اس نے گھر بھر میں اعلان کر دیا تھا کہ اس کی ایک سہیلی نے یہاں کانٹونٹ سکول میں استانی ہے ان دونوں کو سینما کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ کسی نے بھی اس پر اعتراض نہ کیا تھا۔ اس لیے کہ اس خاندان میں لڑکیوں پر اتنی پابندی نہ تھی جتنی کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر ہوا کرتی ہے۔

پورے پانچ بجے وہ دونوں اپنی کوشی سے باہر نکلیں۔ نیلم ہلکے انگری رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی اور نرگس نے سفید شلوار کے اوپر پیازی رنگ کی پھولدار قمیض اور ہلکے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے بالوں کو قدیم۔۔۔ کی دو شیرازوں کی طرح سر کے پیچھے ذرا اوپر کر کے ریشمی رومال سے باندھ رکھا تھا۔

یہ انداز اسے بڑا ہی پیارا لگ رہا تھا۔ ان کپڑوں میں وہ بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی ملک کی شاہزادی ہے۔ اور حیا بانوں میں اپنی خاص سہیلی کے ساتھ چلی

نرگس نے جی گل کی اور وہ دونوں لحاف میں گھس کر سو گئیں۔ باہر کھڑکی کے شیشوں میں سے نیلے، گہرے نیلے آسمان پر بڑے بڑے ستارے بڑی تیزی سے جگمگا رہے تھے۔

دوسرے روز شام کو نرگس اور نیلم کھڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گئیں اور بڑی بے صبری سے محمود کا انتظار کرنے لگیں۔ ٹھیک پانچ بجے محمود گلے میں زرد رومال ڈالے نیلے خوبصورت سوٹ میں ملبوس اوپرندی کے پل پر نمودار ہوا اور سے نیلے سوٹ میں سے اس کا گورا رنگ بڑا بھلا دکھائی دے رہا تھا نیلم نے غور سے اسے دیکھا اور بولی۔

نرگس! لڑکا تو بڑا خوبصورت ہے۔ خدا کرے کہ اس کا دل بھی ایسا ہی صاف اور دھلا ہوا ہو۔ اب جلدی کرو اسے زیادہ دیر وہاں کھڑے رکھنا ٹھیک نہیں۔

محمود نے جب کھڑکی میں اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک اور لڑکی کو دیکھا تو ذرا جھجکا اور اس طرف دیکھنے کی بجائے دوسری طرف تکتے لگا۔ نرگس اور نیلم اس کی قدرتی حرکت پر بڑی محظوظ ہوئیں اور ہنس پڑیں۔

اس کے بعد نرگس نے خط کو ایک پتھر کے گرد لپٹ کر اس پر دھاگہ باندھا اور زور سے اوپر والی جھاڑیوں کی طرف پھینک کر کھڑکی بند کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں کھڑکی کا پردہ ہٹا کر شیشوں کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے لگیں۔

محمود چند لمحے ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد آہستہ سے ڈھلان کے پتھروں کے درمیان سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے اس جھاڑی کے پاس آیا پتھر کے اوپر سے رقعے والا پتھر اٹھا کر جیب میں ڈالا اور

قدمی کو نکلی ہے۔ احتیاطاً اس نے سرخ سویٹر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس لیے کہ اگرچہ اس وقت ذرا گرمی تھی مگر شام کو مری میں بہر صورت خنکی بڑھ جایا کرتی ہے۔ خواہ بارش ہو یا نہ ہو۔

پورے سوا پانچ بجے وہ دونوں سہیلیاں ہوٹل میں اس خاص نشست پر جا کر بیٹھ گئیں اور کافی منگوا کر پینے لگیں۔ نرگس کی نگاہیں ہر لمحہ دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جہاں سے لوگ آ جا رہے تھے۔ اسے ہر پل ایسا گمان ہوتا تھا جیسے ابھی محمود اندر داخل ہو رہا ہے۔ نیلم نے اسے ٹھوکا لگاتے ہوئے کہا

اتنی بے صبری بھی کیا ذرا اپنے آپ میں رہو۔ بس وہ آ ہی رہا ہوگا۔

نرگس شرما کر ہنسنے لگی

کون بے صبر ہو رہا ہے۔

نرگس کا دل دھک سے رہ گیا اس کا رنگ اڑ سا گیا محمود سرمئی رنگ کے بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ قریب آ کر اس نے ان دونوں کو خندہ پیشانی سے سلام کیا۔ دراصل وہ بھی نرگس کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر حیران سا ہو گیا تھا۔

”میرا نام محمود ہے“

”محمود نے نیلم سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا“

”جی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی“

”مجھے بھی خوشی ہوئی ہے، محمود نے کہا اور نرگس کی طرف دیکھ کر مسکرائے لگا“

”آپ کے مزاج اچھے ہیں یا؟“

”نرگس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ نیلم نے کہا“

”ان کے مزاج تو بس ابھی ابھی درست ہوئے ہیں۔ ذرا آپ کے آنے سے پہلے دل

ڈوب رہا تھا۔“

نرگس نے نیلم کو کہنی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ محمود کے چہرے پر بڑی فخریہ ہنسی نمودار ہوئی۔ ایک ایسی ہنسی جو ایک خوبصورت اور فاتح مرد کے چہرے پر ہی نمودار ہو سکتی ہے۔ اس نے برے کو بلا کر کئی ایک چیزوں کا آرڈر دے دیا نرگس نے آہستہ سے کہا

”یہ سب کچھ کھائے گا کون؟“

”نیلم ہنسنے لگی“

”میں کھاؤں گی۔ تم بے فکر رہو۔“

”محمود مسکرائے لگا“

”آپ فکر نہ کریں ہم دونوں کھالیں گے۔“

اس کے بعد وہاں ہنسی مذاق کی دلچسپ باتیں شروع ہو گئیں۔ محمود نے آج زرد رومال کی جگہ گلے میں سرخ ٹائی لگا رکھی تھی جو اس کے گہرے رنگ کو سوٹ کے ساتھ بڑی ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

اس کی نیلی آنکھیں صاف شفاف نیلی جھیلوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ جس پر طلوع ہوتے ہوئے سورج نے اپنا عکس ڈال رکھا ہو۔ اس کا سفید اور سرخ چہرہ سونے کی طرح دمک رہا تھا اور اس کی باتوں میں زندگی کا گرم خون دوڑ رہا تھا۔ وہ بڑے پر جوش اور سرگرم لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ ویسے وہ نیلم سے ہم کلام تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں اٹھا کر نرگس کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

زگس کا جی خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر لطف و کرم کی بارش ہو رہی ہے اور وہ اس بارش میں سر سے پاؤں تک بھیگ رہی ہے۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے کندن کی طرح دمک رہا تھا اور اس کے شباب کی تمام رنگینیاں نکھر آئی تھیں۔ نیلم محمود کی شخصیت پر کشش اور جاذب نظر شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی اور زگس کو اس بات پر بھی بے حد فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا انتخاب عام انتخاب نہیں ہے بلکہ اسے نکتہ چین نیلم نے اپنی جس سہیلی کا بہانہ بنایا تھا وہاں وہ مل گئی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ دوسرے کونے میں بیٹھی دیر سے اسے تک رہی تھی۔

پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور نیلم کے قریب آ کر بولی

”بھئی آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے جو تم یہاں رہ کر بھی مجھ سے نہیں ملتی ہو؟“

نیلم بڑی خندہ پیشانی سے اسے ملی اور معذرت کا اظہار کرنے لگی۔ اس کے بعد اجازت لے کر وہ اپنی نئی سہیلی کے ساتھ اس کی میز کی طرف چل دی۔ اصل میں وہ زگس اور محمود کو اکیلے میں باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی اور خود اس کے لیے کوئی موقع تلاش کر رہی تھی۔ اس سہیلی کو خدا نے ہی کہیں سے بھیج دیا تھا۔

نیلم کے جانے کے بعد جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو انھوں نے اپنے دل ایک دوسرے کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور اپنے دلوں میں ان دونوں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ان کو اس کا موقع دیا اور اوپر سے دونوں نیلم کے ایک دم اٹھ کر چلے جانے سے اطوب سے باتیں کرنے لگے۔

”محمود نے زگس سے کہا“

”آپ کا نام واقعی بڑا خوبصورت ہے زگس ایک ایسا نام ہے جو یا تو پھول کا ہو سکتا ہے

اور یا آپ کا“

”وہ کیوں“ زگس نے آہستہ سے پوچھا

”وہ اس لیے کہ آپ میں اور زگس کے پھول میں کوئی فرق نہیں زگس شرماگئی اور اس نے کافی کی پیالی اٹھالی۔

محمود نیا سگریٹ سلگانے لگا۔

”آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟“

اب تو سگریٹ مجھے پیار کرتے ہیں۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ میں سگریٹ سے پیار کرتا تھا۔ کیسے پیارے دن تھے وہ!“

زگس ہنسنے لگی

آپ عجیب باتیں کرتے ہیں سچ“

”سچ!“

”بالکل سچ“

دونوں ہنس پڑے اور ذرا پرے کھڑا ہوا بیرہ بھی ہنس پڑا اور دوسری میز کی طرف چل دیا۔ زگس کو ایک دم اسی روز والی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جو اس روز محمود کے ساتھ تھی۔ چنانچہ اس کا دل ذرا ذرا ڈوب سا گیا۔ وہ بے چین سی ہو گئی۔ اس نے بہت چاہا کہ اس بات کا ذکر محمود سے نہ کرے مگر اس سے بالکل نہ رہا گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“

محمود نے جلدی سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا

”تم مجھ سے ایک ہزار ایک بات پوچھ سکتی ہو۔“

”نرگس ذرا دیر چپ رہی۔ پھر کہنے لگی“

”آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟“

”محمود نے ذرا حیران ہو کر کہا“

”کیسی بات کہہ رہی ہیں۔ بھلا میں کیوں بُرا مانوں، اور پھر میری کوئی بات ایسی نہیں ہے

حس پر مجھے آپ سے شرمندہ ہونا پڑے۔ آپ بلا تکلف جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیے، میں آپ کی ہر

ت کا پورا پورا جواب دوں گا تاکہ آپ کی تسلی ہو سکے۔“

نرگس کو محمود کی اس بات نے بہت حوصلہ دیا۔ اس کی آدھی تسلی تو محمود کے اس انداز گفتگو

سے ہی ہو گئی مگر آدھی تسلی ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا

”آپ کے ساتھ اس روز وہ لڑکی کون تھی؟“

”محمود ذرا سوچنے لگا“

”کس روز؟“

”اسی روز جب آپ میری تلاش میں یہاں آئے تھے“

”شام کے وقت“

”اوہ آئی سی! اس روز“ پھر وہ ہنسنے لگا۔

بھئی آپ کو خوب یاد رہا، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ لڑکی تھی کیا؟ ارے وہ تو بلا تھی بلا۔

ہمارے رشتہ داروں میں سے ایک زن ہے۔ بس عورت کیا ہے مصیبت ہے۔ ہمارے بڑے بھائی

سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ آپ حال ہی میں یورپ سے واپس آئی ہیں اور شام کو پارٹیوں، کلبوں

اور اسی قسم کی محفلوں میں جانے کے بارے میں اس قدر کریزی ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی۔

اس روز میں قابو آ گیا کہنے لگیں ابھی سیر چل کر کافی پلاؤ۔

”چارونا چار ساتھ چلا آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اب واپس جا چکی ہیں۔“

نرگس نے فوراً محمود کی بات پر اعتبار کر لیا اور اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر ایک

بھاری بھر کم پتھر اٹھا کر پرے پھینک دیا ہو وہ تو کچھ اور ہی سمجھی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ بات کچھ اور

ہی نکلی، اب اس کا دل محمود کی طرف سے بالکل صاف تھا۔

”محمود نے جھک کر پوچھا“

”اب آپ کو یقین آیا یا نہیں؟ اگر یقین نہیں تو مجھے بتادیں تاکہ میں مزید تسلی پہنچانے کی

کوشش کروں۔“

”نرگس بولی“

بالکل یقین آ گیا ہے۔ میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ بھلا مجھے آپ سے ایسی باتیں

پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے؟

”یہ تو آپ کے ذاتی معاملات ہوئے۔“

”محمود ہنسنے لگا۔“

یہ بات نہیں نرگس! آپ کو میری ان باتوں میں دخل دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

اس لیے کہ آپ بھی میرا ایک خاص ذاتی معاملہ ہیں۔ آپ بھی میری زندگی میں داخل ہو چکی ہیں۔

نرگس نے شرم سے سر جھکا لیا۔

یقین کریں میں نے خط میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ صحیح تھا۔ میں نے وہ خط

اپنے دل سے آپ کو لکھا تھا۔ میں واقعی آپ سے محبت کرتا ہوں۔ محبت ہی نہیں بلکہ آپ کی پرستش کرتا ہوں۔ جوں جوں آپ کے قریب آ رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے پہلے آپ سے کروڑوں میل دور تھا اور لق و دق و یرانوں میں خاک اڑا رہا تھا۔ میں نے تو پہلی مرتبہ ایک سرسبز و شاداب نخلستان کا چہرہ دیکھا ہے۔ اس لیے مجھ پر ہمیشہ اعتماد رکھیں۔ میں اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہوں مگر آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔“

نرگس بہت خوش تھی۔ وہ ایک دلفریب طلسمی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں پر رنگین مچھلیاں اس کے پاؤں چومنے کو دوڑتی چلی آئی تھیں۔

”اس نے صرف اتنا کہا“

”آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟“

خدا کے لیے ایسا کلمہ زبان سے مت نکالیں۔ اگر کرن اپنے سورج کو چھوڑ سکتی ہے اور پانی سمندر کو چھوڑ سکتا ہے تو میں بھی آپ سے جدا ہو سکتا ہوں۔

نرگس خاموش ہو گئی۔ محمود نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اسے ظفر کا خیال آنے لگا جو نیلم کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس لیے اس نے محمود سے پوچھ لیا تھا کہ کہیں وہ بھی تو اسے چھوڑ کر نہیں بھاگ جائے گا۔ اور جب محمود نے اسے ایسی بات کہی تو وہ خاموش ہو گئی اسے یقین ہو گیا کہ محمود اور ظفر میں فرق ہے۔

”زمین اور آسمان کا مشرق اور مغرب کا فرق ہے“

”کیسے کافی کا لطف اٹھایا یا نہیں“

نیلم نے ان دونوں کے قریب آتے ہوئے پوچھا، چونکہ استانی مع اپنے بچوں کے

پورے لاؤ لشکر کے چونکہ واپس چلی گئی تھی۔ اس لئے اسے مجبوراً وہاں سے اٹھ کر واپس آنا پڑا تھا۔ اگرچہ وہ ان دونوں محبت کرنے والوں کو تنہائی میں باتیں کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دینا چاہتی تھی۔

”جی ہاں! خوب لطف اٹھایا۔ مگر آپ کی سہیلی نے تو بس ایک ہی کپ پیا ہے۔“

”نرگس مسکرانے لگی“

میں تو کافی کا ایک ہی پیالہ پی سکتی ہوں

اور ہمیں دیکھیے کہ بس صبح و شام کافی پر ہی زندہ ہیں

”نیلم نے ہنسنے ہوں کہا“

جی آپ تو ڈاکٹر لوگ ہوئے فوراً کوئی دوائی بھی ساتھ ہی کھا لیتے ہوں گے۔

”محمود ہنس پڑا“

میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے نرگس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا نیلم نے بھی وقت دیکھا۔

”ہاں بھی اب تو کافی وقت گزر گیا ہے۔“

اس وقت ٹھیک سات بج چکے تھے اور ہوٹل میں پہلے سے زیادہ رش ہو گیا تھا۔ محمود سے جدا ہونے کے بعد نرگس نے درختوں سے گھری ہوئی سڑک پر آن کر سویٹر پہن لیا اور نیلم سے کہنے لگی

”کیوں نیلی! اب بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”نیلم بولی“

تمہیں ایسا اچھا لڑکا حاصل کر لینے پر مبارک باد کہتی ہوں۔

نرگس! مجھے محمود بہت پسند آیا ہے۔ اس کی باتیں بڑی سادہ اور صاف ہیں۔ وہ زیادہ پُر

”نرگس نے تنک کر کہا“

”پھر وہی پر اسرار بات!“

”نیلیم ہنسنے لگی“

بھئی کیا کروں بچپن میں سوائے شرک ہومز کے اور کچھ پڑھا ہی نہ تھا۔

”نرگس نے پوچھا“

”وہ مجھے بھول تو نہ جائے گا؟“

نیلیم نے نرگس کے کان کے قریب آ کر بڑی گہری سرگوشی میں کہا

”شاید کبھی نہیں۔ تم کامیاب ہو“

نرگس کا چہرہ کھل گیا۔ ان کے اوپر پرندہ پھڑ پھڑا کر ہوا میں اڑ گیا۔ نرگس ایک دم ڈر کر نیلیم

کے ساتھ لگ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

فضا نیلی نیلی!

اس ملاقات کے تیسرے روز سمیز ہوٹل کے اسی کونے میں نرگس اور محمود دونوں بیٹھے ایک دوسرے سے بڑے راز دارانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز بڑی گہری اور محبت کے جذبات سے جھلک رہی تھی۔

”نرگس کہہ رہی تھی“

پھر آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

”کوئی بات؟ محمود نے پوچھا“

یہی کہ آپ زرد رومال کیوں باندھا کرتے ہیں؟

نرگس کا خیال تھا کہ شاید اس سے بھی محمود کی کوئی رومانی یاد وابستہ ہے۔ عشق است و ہزار

بدگمانی، کے مصداق نرگس کو بھی کئی قسم کے خیالات پریشان کرنا شروع کر دیتے تھے۔

کبھی اس کا خیال ہوتا کہ شاید یہ کسی لڑکی نے محمود کو تحفہ دیا ہے کبھی وہ سوچتی کہ شاید یہ

رومال کسی خاص واقعہ یا حادثے کے بعد ہر وقت محمود کیساتھ رہنے لگا ہے۔ حقیقت میں وہ محمود پر پوری

طرح قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس قلعے پر صرف نرگس کا ہی جھنڈا لہرا رہا ہو اور ایسا

کرنے میں وہ حق بجانب بھی تھی۔

اس لیے کہ وہ دل و جان سے محمود کے ساتھ تھی۔
”محمود نے کہا“

ارے یہ بات ہے! یہ رومال تو بس یونہی چونکہ مجھے پسند ہے۔ اس لیے میرے ساتھ رہنے لگا ہے، مگر آپ کیوں خیال کرنے لگیں؟
”نرگس نے دوسری طرف منہ کر لیا محمود ہنس پڑا“

اچھا اب سمجھا آپ کا خیال ہوگا کہ شاید یہ رومال کسی لڑکی نے مجھے تحفہ میں دیا ہوگا۔ یعنی نشانی کے طور پر! بالکل غلط خیال ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری زندگی میں صرف ایک لڑکی نے داخل ہونے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس میں ناکام رہی اس لیے کہ وہ مجھے ناپسند تھی۔ مجھے اس کی عادتیں ناپسند تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بڑے گھرانے کی ”مہذب“ لڑکی تصور کرتی تھی اور اس طرح وہ ہر معاملے میں اپنی سر بلندی دکھانا چاہتی تھی۔

یہ بات مجھے بہت بُری لگتی تھی اور پھر شکل و صورت میں بھی وہ کوئی خاص دلچسپ لڑکی نہ تھی۔ چنانچہ لازمی طور پر اُسے میرے دل کے دروازے کے پاس سے ہو کر واپس جانا پڑا۔

”نرگس نے کہا“

لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ نے اسے بھلا دیا ہے؟

”محمود نے حیرانی سے کہا“

”نرگس! یہ آپ کیا موضوع لے کر بیٹھ گئی ہیں؟ یقین کیجئے میں نے اسے کبھی یاد نہیں کیا اور پھر یاد بھی کیسے کرتا۔ مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہ تھی۔ وہ تو ایک ہی گھرانے میں رہنے کی وجہ سے ہمارے درمیان ذرا بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ لڑکی چونکہ باہر کی ہو ا کھا کر آئی ہوئی تھی اس لیے اس

نے ذرا زیادہ بے تکلفی کا اظہار کیا اور کوشش کی کہ میں بھی اس کی طرف رجوع کروں“

پھر آپ نے کیا کیا؟

میں نے؟ وہی جو اس سے بیشتر بتا چکا ہوں کہ اپنا دامن واپس کھینچ لیا۔ ارے بھی مجھ ایسے لڑکے کو ایسی لڑکیاں کبھی پسند نہیں آ سکتیں

”لیکن وہ تو آپ کو ضرور پسند ہوگی“

”وہ کیوں“

”اس لیے کہ وہ انگلینڈ ریٹرنڈ تھی۔“

”محمود بے اختیار ہنس پڑا اور اس کے دانت چمکنے لگے“

بھی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ایسی صفت ہے جس کی وجہ سے کسی کے ساتھ

اندھا دھند محبت ہو جائے۔

”کیوں نہیں“

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے چھیڑنا چاہتی ہیں“

”نہیں بلکہ اصلیت کا سراغ لگانا چاہتی ہوں“

”محمود نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔“

دیکھو نرگس! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں اور اب بھی

یہی کہتا ہوں کہ میرے دل میں آج تک سوائے تمہارے اور کسی کے لیے کبھی بھی جگہ پیدا نہیں ہو سکی۔

اگر تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا تو میں مجبور ہوں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ خود کشی کر لوں اور

میرے ”آپ سے“ تم“ کہنے پر مجھے معاف کر دینا۔ میں

تمہیں آج سے اسی طرح مخاطب کیا کروں گا۔ تم بھی مجھے اسی طرح، اسی بے تکلفی سے مخاطب کر سکتی ہو۔ اس طرح زیادہ محبت کا اظہار ہوتا ہے اور اجنبیت باقی نہیں رہتی

”کہو یقین آیا؟“

زگس کو بہت دیر کا یقین آچکا تھا مگر وہ کج بخشی کر رہی تھی اور محمود کو یونہی تنگ کرنا چاہتی تھی۔ یا کرید کرید کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کہیں اس کے دل کے کسی چھپے ہوئے کونے میں کسی دوسری لڑکی کا کوئی خیال، کوئی یاد تو باقی نہیں مگر اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس نے سوائے اس کے اور کسی سے آج تک محبت نہیں کی۔

”اس نے کافی ختم کرتے ہوئے کہا“

”تھوڑا تھوڑا اور ہنسنے لگی“

”محمود نے سگریٹ کا کش لے کر اطمینان کا اظہار کیا“

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ خواہ مخواہ خودکشی کر کے بعد میں پچھتانا پڑتا۔“

”کیسے؟ مجھے یا آپ کو؟“

”دونوں کو“

”وہ کیسے“

تم اس لیے پچھتا تیں کہ تمہاری وجہ سے میں نے خودکشی کی اور میں اس لیے پچھتا تا کہ خواہ مخواہ جان گئی۔

”زگس ہنسنے لگی“

”مگر آپ کے نصیب دشمنان زندہ ہی نہ ہوتے۔“

”مگر میں خودکشی ہی ایسی کرتا کہ بعد میں بچا لیا جاتا“

”محمود کھلکھلا کر ہنس پڑا“

زگس ہنستے ہنستے ذرا رک سی گئی۔

اسے محمود کی یہ بات اچھی نہ لگی اسے یوں لگا جیسے محمود اس سے زندگی کے کسی دور میں دھوکا بھی کر سکتا ہے۔ مگر جب اس نے محمود کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا تو وہ اس خیال کو بالکل ہی بھول گئی۔ سوائے محبت اور اس کے رنگین خیالات کے اور اس کے ذہن میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔

”محمود نے کہا“

اچھا اب ایک بات میں بھی پوچھوں؟

”ضرور پوچھیے“

کیا تمہیں بھی کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟

”کبھی نہیں زگس نے بڑے صاف لہجے میں کہا“

”مجھ سے بھی نہیں“

”زگس شرما گئی اور چپ ہو گئی“

”بتاؤ نا؟ مجھ سے بھی نہیں ہوئی“

آپ کا معاملہ دوسرا ہے کسی دوسرے کو میں نے آج تک کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔

ارے ہاں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں

محمود نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کیا؟

”نرگس نے کہا“

ہماری لاہور والی کوٹھی کے ہمسائے میں ایک صاحب ہیں جو مجھے روزانہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر گھورا کرتے ہیں۔

”وہ کیوں“

”جانے کیوں“

تم اسے پسند آگئی ہوگی

”شاید ایسا ہی ہو“

ضرور ایسا ہی ہوگا

اس نے تو یہاں تک کیا کہ ایک روز مجھے خط بھی لکھ دیا

”ارے! اتنی جرات؟“

بلکہ وہ خط ہماری دیوار پر چڑھ کر ہمارے لان میں میرے سامنے پھینک دیا

اور تم نے اٹھا لیا

اٹھاتی نہ تو اور کیا کرتی۔ کوئی دوسرا وہاں سے اٹھا کر پڑھ لیتا تو شامت ہی آ جاتی۔ وہ خیال

کرتے جانے کب سے محبت کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے۔

اچھا پھر کیا ہوا

پھر کیا ہوتا تھا۔ میں نے فوراً خط اس کے سامنے ہی پرزے پرزے کر کے آتش دان میں

پھینک دیا

اور اس خط میں کیا لکھا تھا؟

وہی جو عام طور پر ایسے خطوط میں لکھا ہوتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ جب سے دیکھا ہے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

”کیا اس نے پھر بھی خط لکھا؟“

”پھر اسے کیسے جرات ہو سکتی تھی“

اور اگر وہ لکھتا تو

تو میں ابا جان کو بتا کر اس کی خوب مرمت کرواتی

”محمود نے سگریٹ کا کش لگا کر ہنستے ہوئے کہا“

”ویسے وہ کیسا تھا؟“

ارے بالکل بھینسا تھا۔ جنگلی بھینسا! بلکہ افریقہ کا گوریلہ تھا۔ چچک کے داغ، چٹیلی ناک، کالا رنگ، ٹھگنا ساق میں تو حیران ہوں کہ آپ کس بل بوتے پر مجھے سے عشق فرمانے چلے تھے۔

”محمود قہقہہ لگا کر ہنس پڑا“

”عشق اندھا ہوتا ہے“

”اندھا تو تھا ہی لیکن اس کے منہ پر چچک کے داغ بھی ہوتے ہیں۔ یہ مجھے تب ہی معلوم

ہوا تھا۔“

”محمود نے پھر قہقہہ لگایا“

بھی بعض اوقات بڑی دلچسپ بات کر دیتی ہو۔ اچھا تو پھر مجھ میں تمہیں کوئی خوبی نظر

آئی تھی؟

نرگس اس کا کوئی جواب نہ دینا چاہتی تھی مگر جب محمود نے بہت مجبور کیا تو صرف اتنا ہی کہہ

ہی ہلکا ہلکا اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ نیچے کھلی وادی تھی جس کی جانب سے بڑی سرد ہوا آرہی تھی۔ جس سڑک پر وہ دونوں چل رہے تھے وہاں ایک بھی آدمی نہ تھا۔ ویسے بھی سردی کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے لوگ شام کو بہت کم باہر نکلتے تھے۔ بارش کا بھی ڈر تھا۔ نرگس گرم لمبے کوٹ میں ملبوس، گلے کے گرد سرخ اور بنسنتی رنگ کا خوبصورت ادنی مفلر لپیٹے، دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دیئے بڑے آرام سے محمود کے ساتھ چل رہی تھی، محمود نے نککیوں سے کئی بار نرگس کی طرف دیکھا اور ہر بار وہ اس کے خوبصورت چہرے اور سنہری ریشمی بالوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

جو چیز اُسے نرگس کے چہرے پر سب سے زیادہ پسند تھی وہ اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں کے بعد اس کے جذباتی ہونٹ تھے۔ یہ ہونٹ بڑے خاص قسم کے تھے اوپر والا ہونٹ ایک پتلی کمان کی طرح تھا اور نچلا ہونٹ ذرا موٹا اور پھول کی چوڑی پتی کی طرح شاداب تھا۔ وہ بھرا بھرا اور رسیلا سا تھا۔

نرگس جب بات کر رہی ہوتی تھی تو یہ ہونٹ بڑے روح کو گرمادینے والے زاویے بنایا کرتا تھا۔ محمود کا دل کئی بار ان ہونٹوں کے بے اختیار چوم لینے کو چاہا تھا مگر وہ ہر کسی خاص وقت کے انتظار میں چپکا ہو کر رہ گیا تھا۔

آج شام کو جب اس نے سڑک کو بالکل سناں دیکھا تو اس کا جی مچلنے لگا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ ایک جگہ درختوں کے جھنڈوں کے نیچے خالی بیچ پڑا تھا۔ محمود نے بیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

میرا خیال ہے ذرا یہاں بیٹھ کر وادی کا نظارہ کیا جائے
”نرگس کہنے لگی“

سکی۔

”آپ بڑے اچھے ہیں، ہر نو جوان سے اچھے ہیں“

”بس“

”کیا اتنی بات کافی ہے؟ میرے لیے تو یہی بہت کچھ ہے۔“

”اس کے بعد بیر آگیا۔ اس نے کافی کے خالی برتن اٹھانا شروع کر دیئے۔“

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے“

”اتنی جلدی“

”کافی دیر ہو گئی ہے۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے“

نہیں بے بی یہاں کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھ بھی لیا تو کہہ دینا میری ایک سہیلی کا خاوند تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہاں بیٹھ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کافی کا ایک دور اور چل جانا چاہیے۔

”نہیں محمود اب واپس چلتے ہیں۔“

محمود نے جب دیکھا کہ نرگس واقعی وہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تو اس نے اسے زیادہ مجبور کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

”اچھا جیسے تمہاری مرضی“

پھر بیرے کو بل لانے کے لیے کہا۔ بل ادا کر کے وہ دونوں وہاں سے اٹھے اور دوسری طرف سے ہو کر پرلے بازار کی طرف نکل گئے۔ یہاں سے وہ ایک ایسی سڑک پر آگئے جو اوپر ٹیرس ہوٹل کے کھنڈروں میں نکل گئی تھی۔

اب شام ہونے ہی والی تھی۔ سورج بادلوں میں جا چھپا تھا۔ جس کی وجہ سے شام سے پہلے

”کوئی آجائے گا۔“

”محمود نے ایک ہاتھ سے زگس کو ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا“

”تو پھر ہم چلے جائیں گے“

زگس ہنسنے لگی۔ اس نے سوچا کہ محمود کسی قدر دلچسپ شخصیت رکھتا ہے۔ نیلم تو خشک اصول پرست لڑکی ہے، بھلا اتنے خوبصورت اور صحت مند آدمی کے سامنے بیمار اصول کب تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے آہستہ سے محمود کا ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش بھی کی

”محمود نے کہا“

”کیا یہ ہاتھ اس قابل نہیں زگس؟“

”زگس خاموش رہی وہ کہنا چاہتی تھی کہ“

”یہ ہاتھ میری زندگی کا سہارا ہے“

مگر عام لڑکیوں کی طرح اس مقام پر پہنچ کر اس کی بھی جرات نہ ہوئی کہ کھل کر بات کر سکتی۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا سارا کالج کا علم اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے اور وہ بچ منجہ دار میں ہے اور وہ سارا علم اسکی ساری کتابیں ساحل پر کھڑی اسے حیرت اور افسوس کے ساتھ تک رہی ہیں

”وہ کانپ سی گئی۔“

”کوئی آجائے گا“

یہاں کوئی نہیں آئے گا زگس! یہاں سوائے شام کی سرخی کے، وادی کی دھند کے اور میرے اور تمہارے اور کوئی نہیں۔ یا یہ درخت ہیں۔ مگر یہ تو بے زبان ہیں اور پھر انھوں نے ہم پر اپنا

”دیر ہو جائے گی کہیں گھر میں شامت نہ آجائے“

”بھی کہہ دینا کھیلی کے ہاں دیر ہوگئی۔ اس نے زبردستی چائے کے لیے بھلا رکھا تھا۔“

”زگس خاموش ہوگئی اور وہ دونوں بچ پر اکیلے بچ پر جا کر بیٹھ گئے“

اب ایک منٹ کیلئے دونوں خاموش ہوئے ان دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آنے والے حادثے کا ان دونوں کو نجومی علم ہے اور ان دونوں میں سے ہر فرد اس کا دل و جان سے انتظار کر رہا تھا۔ مگر پہل کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ یا پہل کرتے ہوئے ڈرتا ہے

”آخر محمود نے کہا“

”سردی تو نہیں لگ رہی زگس“

زگس نے کندھے سکڑتے ہوئے کہا

”جی نہیں“

زگس کی آواز قدرے اکھڑی اکھڑی اور مضطرب سی تھی۔ محمود نے موقع غنیمت جانتے ہوئے آہستہ سے اپنا ایک ہاتھ زگس کے کندھے پر رکھ دیا۔

زگس کا جسم کپکپا گیا۔ بظاہر اس نے کوئی حرکت نہ کی زبان سے بھی کچھ نہ بولی، صرف کندھا ذرا سا اور سمیٹ لیا اسے فوراً نیلم کی نصیحت یاد آگئی کہ ہمیشہ پر اسرار بن کر رہنا سب کچھ محمود پر ظاہر مت کر دینا۔

”چنانچہ وہ وقت کا انتظار کرنے لگی“

اتنے میں محمود نے بڑے پیار کے ساتھ زگس کو اپنی طرف ذرا سا کھینچا زگس نے آہستہ

سے کہا۔

سایہ کر رکھا ہے۔ یہ ہمارے مہربان دوست ہیں یہ خاموشی کی زبان میں بھی کبھی کسی کو ہمارا راز نہ بتائیں گے۔

نرگس کا جسم کاپنے لگا اور اس کے ہونٹ خشک پڑ گئے۔ حلق بھی خشک ہو گیا اور کوشش کے باوجود اسے نیلم کی کوئی بھی بات یاد نہ آئی۔ اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔ مگر وہ سب کچھ اب کہاں ہے؟

جب وہ یہ سوچ رہی تھی تو محمود نے آہستہ سے اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کے ہونٹوں پر بڑی محبت، پیار اور نفاست سے اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔

نرگس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مخملیں قالینوں پر لیٹی، پھولوں کے خوشبودار ہار پہنے ساتھ پریوں کی ٹولی میں ملکہ بنی بیٹھی ہے اور قالین پر آسمان کی نیلگوں بلند یوں میں پرواز کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر یوں لگے تھے جیسے وہ عبادت کر رہی ہو۔

جب وہ علیحدہ ہوئی تو اس کا رنگ سرخ تھا اور رخسار دہک رہے تھے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

”اس نے جلدی سے کہا“

مجھے گھر تک چھوڑ آئیں۔

محمود بھی جلدی سے اٹھا اور اس کے ساتھ ساتھ سپرنگ لاج کی طرف چل پڑا ایک خاص مقام تک جا کر محمود نے آہستہ سے نرگس کا ہاتھ دبایا۔ نرگس اس کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائی اور دونوں جدا ہو گئے۔

دوسرے ہفتے نیلم نے اپنی استانی سہیلی کے ساتھ مل کر مری سے ایبٹ آباد کی سیر کا پروگرام بنایا۔ یہ پروگرام خاص طور پر نرگس اور محمود دونوں کی آزادانہ فضا میں کھلی ملاقاتوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ نیلم نے اپنی سہیلی استانی کو یہ بتایا تھا کہ محمود ان کا رشتہ دار ہے اور اس کی اور نرگس کی منگنی ہو چکی ہے اور اگلے ماہ لاہور میں شادی ہو رہی ہے۔ لیکن یہاں انھیں آزادانہ میل ملاپ کی اجازت نہیں اور وہ دونوں آپس میں بے حد پیار کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملے بغیر نہیں رہ سکتے۔

استانی کے اگرچہ بال بچے تھے مگر اپنے زمانے میں بڑی آزادی پسند لڑکی رہ چکی تھی اور اس نے بھی پسند کی شادی کی ہوئی تھی۔ اس نے نیلم کے اس پروگرام کو بہت پسند کیا اور ان دونوں کے میل ملاپ کی پرزور تائید کی۔

ان دونوں کو آپس میں ضرور ملنا چاہیے۔ اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

”اس لیے یہ پروگرام بننا ہی ہوں نیلم نے کہا“

بالکل ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ہمراہ چلوں گی۔ چنانچہ اس پروگرام کی اطلاع محمود کو کر دی گئی۔

نیلم نے کچھ ایسا بندوبست کیا کہ اس پک پک پر وہ دونوں ہی جائیں۔ گھر میں انھوں نے کہہ دیا کہ یہ پک اسکول کی جانب سے ہو رہی ہے اور ان دونوں کو مہمانوں کی حیثیت سے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے۔

چنانچہ اس پر کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔ اس لیے کہ انھیں یقین تھا کہ وہ دونوں اسکول کے ہمراہ جائیں گے اور ان ہی کے ساتھ واپس آ جائیں گی۔ نرگس بے حد خوش تھی اور پھولی نہ سما رہی تھی۔

”تقریباً یہ حال محمود کا تھا۔“

اس نئے پروگرام نے اس کی امیدوں کو زندہ کر دیا تھا۔ اس طرح اسے نرگس کے ساتھ پوری آزادی اور بے فکری کے ساتھ ایبٹ آباد کی پرفضا کھلی وادی میں گھومنے کا موقع ملے گا۔ بھلا کون ایسا عاشق ہوگا جو اپنی محبوبہ کے ساتھ ایسا موقع ملنے پر خوشی سے نہال نہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ایبٹ آباد میں اس کا اپنا مکان تھا جو خوش قسمتی سے خالی پڑا تھا کیونکہ چند روز پیشتر اس کی والدہ اور والد وہاں دو ہفتے گزارنے کے بعد بچوں سمیت واپس پنڈی جا چکے تھے۔ اس نے مری ہی سے ایبٹ آباد والی کوشی کے ملازم کو تار دے دیا کہ وہ لوگ وہاں پہنچ رہے ہیں مکان کی صفائی کر چھوڑے۔

اب اس نے وہاں سے روانگی کی ابتدائی تیاریاں مکمل کرنا شروع کر دیں۔ اسے کوئی ایسی لمبی چوڑی تیاریاں نہ کرنا تھیں۔ بس بستر ہی باندھنا تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے ایک دوست کی کوشی میں مقیم تھا اور ایبٹ آباد والے ذاتی مکان میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

روانگی سے ایک دن پہلے اس نے ٹیکسی کا بھی بندوبست کر لیا اور اسے پیشگی رقم دے دی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ استانی کے اسکول میں نیلم اور نرگس پہلے ہی سے پہنچ جائیں۔ پھر وہاں سے ان دونوں کو محمود ٹیکسی میں جا کر لے لے اور ایبٹ آباد کی طرف کوچ بول دیا جائے۔

”لیکن عین وقت پر استانی کی طبیعت خراب ہو گئی۔“

اسے سر درد کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ نہ جاسکی لیکن اس نے دونوں کو یقین دلایا کہ راز کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اور مری میں ان کے گھر والوں پر یہی ظاہر کیا جائے گا کہ وہ لوگ دوسری استانی اور بچوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایبٹ آباد چلے گئے ہیں۔

ٹھیک وقت پر آ کر محمود نے آ کر نرگس اور نیلم کو ٹیکسی میں اپنے ساتھ لیا اور گاڑی ایبٹ آباد کی طرف روانہ ہو گئی جب گاڑی مری کی مضافات میں پہنچ گئی تو محمود نے پوچھا

”استانی صاحبہ کہاں ہیں“

”نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا وہ بیمار ہو گئیں“

محمود نے دل میں کہا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ کاش گھر پہنچ کر نیلم کی بھی طبیعت ذرا خراب ہو جائے؟

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنے آپ کو مذمت کی کہ وہ ایک ایسی لڑکی کے بارے میں اس قسم کی خود غرضی کا اظہار کر رہا ہے جو اس کی محسنہ ہے اور جس نے اس کے لیے بہت کام کیا ہے اور کر رہی ہے۔

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہوئی“

”نیلم نے کہا“

ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ یہ استانی بڑی بور ہے اس نے پک ٹک کا سارا مخراب کر دینا تھا۔

”محمود نے سگریٹ سلکاتے ہوئے کہا“

”پھر بھی ذرا لطف تو رہتا۔“

اب گاڑی انتہائی گلی کی طرف چلی جا رہی تھی، راستہ بڑا خوشگوار اور پرفضا تھا۔ نیچے ڈھلان پر دور دور تک گیہوں اور باجرے کے کھیت سیڑھیوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے کہیں سبزہ لہرا رہا تھا اور کہیں صرف پانی چمک رہا تھا۔

ایک جگہ بل پر ایک چرواہا بیٹھی تھی۔ کچھ بکریاں اس کے پاس ہی چر رہی تھیں۔ ذرا نیچے

اندر آجائیں یہاں سردی ہے

سب لوگ وہاں سے اندر ڈرائینگ روم میں آ گئے، جب وہ وہاں آ کر بیٹھ گئے تو ملازم نے

کہا۔

”صاحب غسل کے لیے گرم پانی تیار ہے“

”ہاں بھئی تم لوگ ضرور نہالو۔ دونوں غسل خانے تیار ہیں“

”بھئی میں تو ضرور نہاؤں گی۔ نیلم نے کہا“

میں بھی نہاؤں گی۔ بڑی تھک گئی ہوں نرگس نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے نیلم کی

تائید کی

”تو چلیے“

محمود ان دونوں کو ساتھ لیکر غسل خانے کی طرف لے گیا۔ انھیں دروازے پر چھوڑ کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا۔ سلیپنگ روم کی طرف سے آن داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے دروازہ بند کیا۔ جلدی سے مینٹل پیس کی طرف بڑھا۔ جہاں ایک بڑے سے کشادہ فوٹو سٹینڈ میں ایک لڑکے اور لڑکی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے گلوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ اس تصویر میں لڑکا جو تھا اس کی شکل محمود سے کافی ملتی جلتی تھی اور لڑکی ایک اجنبی تھی۔

محمود نے اس تصویر کو اٹھا کر کپڑوں والی الماری کے سب سے نچلے خانے میں بند کر کے تالا

لگایا۔ چابی اپنی پتلون کی چھوٹی عقبی جیب میں رکھی اور اطمینان کا سانس لیا۔

”اس کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ملازم کو آواز دی۔“

”جگو دادا! میرا سوٹ کیس اور دوسرا سامان اس طرف لے آؤ“

ایک کسان زمین پر پل چلا رہا تھا۔ ہوا میں خنکی اور سبزے کی مہک تھی۔ موسم بڑا صاف تھا اور دھوپ خوب چمک رہی تھی۔

جس وقت یہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو شام ہونے ہی والی تھی۔ سورج ہزارہ کی پہاڑیوں پر جھک آیا تھا اور دھوپ کا رنگ سنہری ہو رہا تھا۔ پرندوں کی ٹولیاں مشرق کی طرف اپنے اپنے آشیانوں کی سمت پرواز کرنے لگی تھیں۔

ایبٹ آباد کے بازاروں میں اگرچہ اتنی سردی تو نہ تھی پھر بھی لوگ گرم کپڑوں میں ملبوس چھڑیاں ہاتھ میں لیے ادھر ادھر چہل قدمی کر رہے تھے۔

محمود کی کوٹھی شہر کے باہر ایک پن چکی کے اوپر ڈھلان پر واقع تھی۔ یہ جگہ بڑی پر فضا اور خوبصورت تھی۔ کوٹھی اگرچہ چھوٹی تھی مگر چیزہ کے اونچے لمبے گھنے درختوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کوٹھی کے سامنے چھوٹا سا باغ بھی جہاں قسم قسم کے پھولوں کے پودے تھے جن پر پھول مسکر رہے تھے۔

لان میں گھاس ترشی ہوئی تھی اور لیموں کے پیڑ کے نیچے ایک طرف دو کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ جب گاڑی کوٹھی کے دروازے پر پہنچی تو بوڑھے ملازم نے آکر دروازہ کھول دیا۔ گاڑی وہاں سے گزر کر کوٹھی کے پورچ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

بوڑھے ملازم نے جلدی جلدی سامان اتار کر لابی میں رکھنا شروع کر دیا۔ محمود نے ڈرائیو کو ٹپ دیا۔ ڈرائیو نے سلام کیا اور گاڑی دوسرے گیٹ سے نکال کر باہر لے گیا۔

نرگس اپنا بیگ اور اوور کوٹ سنبھالتی ہوئی ایک دم کرسی پر بیٹھ گئی۔ نیلم بھی اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ملازم نے جیب سے چابیاں نکال کر دروازہ کھولا۔ محمود نے کہا

”بہت اچھا سرکار باورچی خانے کی طرف سے آواز آئی۔“

جب سارا سامان اندرا گیا تو محمود نے اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے اپنے شب خوابی کا لباس اور دوسرے پہننے کے کپڑے نکالنے شروع کر دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے کپڑے اتار کر ہلکا پھلکا لباس پہنا۔ اوپر سے سلیپنگ گاؤن اوڑھا۔ سگریٹ سلگایا اور بستر پر نیم دراز ہو کر غور کرنے لگا۔

وہ بہت سی باتوں پر اس وقت غور کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر کسی فکر کا کوئی بھی نشان تھا۔ وہ مکمل مطمئن اور پرسکون تھا۔ حالانکہ اس کے ذہن میں خیالات کا ایک سمندر تھا جس میں زبردست طوفان سا آرہا تھا۔ اوپر روشن دان دھوپ کی سنہری سے گہرا سرخ ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ مدھم ہونا شروع ہو گئیں۔ باہر برآمدے میں زنگس اور نیلم کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

”محمود جلدی سے باہر آ گیا۔“

”اس طرف جناب والا“

دونوں کے بال تولیوں میں لپیٹے ہوئے تھے اور چہرے یوں شگفتہ تھے جس طرح صبح کے وقت کنول کے پھول تروتازہ ہوتے ہیں۔ ان میں زنگس کا سفید رنگ تو بے حد نکھر رہا تھا اور وہ بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

”محمود ان دونوں کو خواب گاہ میں لے گیا۔“

”آپ یہاں کپڑے وغیرہ تبدیل کر لیں اور میں چائے منگواتا ہوں۔“

زنگس اور نیلم نے خواب گاہ میں داخل ہو کر دیکھا کہ کمرہ بڑے تکلف کیساتھ سجایا گیا تھا۔ آتش دان بالکل سامنے مہاگنی کے سیاہ پاؤں والے شاندار دوپٹے بچھے ہوئے تھے جن پر سرخ رنگ کی

ریشمی چادریں پڑی تھیں۔

کارنس پر تانبے کے دو بہت بڑے پھول دان رکھے تھے جن میں تازہ پھول اپنی مہک دے رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پھول دوپہر کو ہی توڑ کر یہاں سجائے گئے تھے۔ کارنس کے اوپر سنہری فریم میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی تصویر تھی جس نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کا ناک نقشہ محمود سے مشابہ تھا۔ چنانچہ وہ دونوں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئیں کہ وہ تصویر محمود کے والد کی ہے۔

سامنے دیوار کے ساتھ چند ایک آرام کرسیاں بچھی تھیں جن پر سرخ ریشمی گدیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا کامدار بار یک جالی دار پردہ پھیلا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دروازے پر بھی اس قسم کا پردہ جھول رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے کی شان و شوکت سے کافی متاثر ہوئیں، دونوں نے اپنے اپنے سوٹ کیس پٹنگ پر رکھ کر کھول دیے اور کپڑے باہر نکالنے لگیں۔ نیلم کے دل کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اُسے زنگس کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ اب اس پر یہ بات بالکل عیاں ہو گئی تھی کہ محمود ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے ویسے بھی وہ اس شخص کی دلچسپ اور پرکشش شخصیت سے کافی متاثر ہو چکی تھی اور اب اس کا مکان دیکھ کر اس کا وہم یقین میں بدل گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ محمود کو پہلے ملی ہوتی۔ یعنی زنگس سے ملنے سے پہلے ہی وہ اس سے ملاقات کر چکی ہوتی۔ اس کا دل فتح کر چکی ہوتی۔ مگر اب تو کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ فوراً ہی اسے اپنے خیال سے بڑی ندامت ہوئی بھلا وہ اپنی سہیلی کے ساتھ ایسی غداری کیونکر کر سکتی تھی۔ زنگس بڑی بھولی لڑکی ہے اور بڑی معصوم ہے وہ اسے کبھی دھوکا نہیں دے

سکتی۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اس قسم کی مجرمانہ باتوں کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیا اور بڑے اطمینان سے کپڑے تبدیل کرنے لگی اور بولی

”یہاں کا پانی مری سے ہزار درجے بہتر ہے۔“

”ہاں! میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے۔ بال فوراً نکھر گئے تھے۔“

”اری تمہارا تو چہرہ بھی نکھر گیا ہے۔“

”نرگس شرمائی۔“

”تم مذاق نہ کرو گی تو اور کون کرے گا؟“

”نیلیم نے جلدی سے کہا“

مگر بھی تمہیں تو میرے علاوہ بھی ایک مذاق کرنے والا موجود ہے معاملہ تو ہمارا ٹیڑھا ہے۔

”نرگس نے مذاق میں کہا“

”تو پھر تم بھی محمود سے محبت شروع کر دو“

نیلیم کانپ گئی، اپنے دل میں کئی روز سے وہ اس قسم کی باتیں سوچ رہی تھی، مگر اس نے ان باتوں کو اپنے چہرے پر یا کسی بھی حرکت سے ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ اب ایک دم نرگس کی زبان سے اپنے دل کے چور کا نام سن کر وہ کانپ سی گئی۔ پھر وہ فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولی

چل ہٹ بے وقوف کہیں کی! ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔

لیکن اپنے دل میں اس نے کہا کاش ایسا ہو سکے

کاش ایسا ہو سکتا!

☆☆☆☆☆☆☆☆

مارِ آستین

چائے بڑی پر تکلف تھی جولان میں لیموں کے پیڑ تلے بیٹھ کر پی گئی۔

محمود نے اپنے ہاتھ سے پیالی بنا کر نرگس کو دی۔ نہ معلوم کیوں نیلیم کو یہ بات اچھی نہ لگی۔

چائے سے فارغ ہو کر وہ لوگ سینما دیکھنے چل دیے فلم بڑی گھٹیا قسم کی تھی۔ نیلیم کا سر درد کرنے لگا۔

نرگس نے کہا

میں بھی بور ہو رہی ہوں

محمود نے واپس اٹھ چلنے کا پروگرام پیش کر دیا۔ جس پر فوراً عمل کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ تینوں سینما کے باکس سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے گھر آ گئے۔ گھر پہنچے تو ملازم نے رات کا کھانا لگا دیا تھا۔ کھانے میں مرغ، بریانی اور کوئٹے تھے۔

نیلیم نے کہا

یہ آپ کا ملازم تو بڑا اچھا خانساں بھی ہے

”محمود ہنسنے لگا“

جی ہاں! بوڑھا بابا بڑی دیر سے ہمارے ہاں کام کر رہا ہے پہلے یہ راوہلپنڈی میں ہمارے ہاں تھا۔ پھر وہاں یہ بیمار رہنے لگا اور اب ہم نے اسے مستقل طور پر اپنے اس پہاڑی مکان میں منتقل کر دیا ہے۔

”زرگس نے پوچھا“

”اس کے کوئی بیوی بچہ نہیں ہے کیا؟“

صرف ایک لڑکی تھی جو فسادات میں شہید ہو گئی یا اغوا کر لی گئی۔ اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ ہم نے شروع شروع میں اس کی بچی کے لیے کافی دوڑ دھوپ کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

”زرگس نے بڑے افسوس کا اظہار کیا“

”بے چارہ بوڑھا۔ کیسے صبر آیا ہوگا اسے؟“

”محمود بولا“

یہی تو ایک بات ہے جو انسان کو زندہ رکھتی ہے کہ اسے صبر آ جاتا ہے اور بہت جلد وہ اپنے آپ کو سمجھا بچھا لیتا ہے۔

”نیلیم نے کہا“

”مگر بعض لوگ تو عمر بھر ایک ہی غم کو سینے سے لگائے روتے رہتے ہیں۔ انھیں صبر

کیوں نہیں آتا؟

”محمود نے مرغ کی ایک ٹانگ کاٹ کر زرگس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔“

”ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور پھر ان کا صبر نہ کرنا ہی ان کے لیے بہتر ہوتا ہے“

”وہ کیوں نیلیم نے پوچھا“

”وہ اس لیے کہ شاید اگر وہ صبر سے کام لیں تو کبھی زندہ نہ رہ سکیں“

”کھلی کھڑکی میں سے دور اوپر ڈھلان پر اگے ہوئے چیزھ کے درختوں کی ہوا“ ٹھنڈی اور مہکیلی ہوا

اندر داخل ہو رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ تینوں باہر نکل کر کھلی ہوا میں باغ کی روش پر ٹہلنے لگے

نیلیم تو سردرد کا بہانہ بنا کر اندر کمرے میں چلی گئی اور محمود زرگس دونوں سیر کرتے کرتے چشمے تک نکل گئے۔ اس چشمے پر جنگلی ناشپاتیوں کے گھنے درخت تھے اور پانی کے پتھروں پر گرنے کی بہکی بہکی مترنم آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

زرگس اور محمود ایک جگہ بڑے سے پتھر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اب سردی ہو گئی تھی۔ محمود زرگس کا گرم ہاتھ آہستہ آہستہ سہلا رہا تھا اور اس سے آہستہ آہستہ محبت بھری آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

مجھے خواب میں بھی کبھی اس کا خیال نہ آیا تھا کہ ہم دونوں اتنی عظیم الشان تنہائی اور خاموشی میں اس خوبصورت چشمے کے کنارے کہیں اس طرح بیٹھ کر محبت کی زبان میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوں گے۔ جب میں نے تمہیں گاڑی میں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں نے اپنے آپ کو اس قدر خوش قسمت تصور نہیں کیا تھا۔

کیا تم نے بھی کبھی ان ملاقاتوں کا خیال کیا تھا؟ کیا تم نے بھی کبھی ایسا سوچا تھا؟

زرگس خاموش تھی اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں اور چہرہ ازلی محبت کے سرحدی نور سے جگمگا رہا تھا۔ وہ محمود سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو چکور کو چاند سے ہے اور چاند کو لہروں سے ہے اور لہروں کو اپنے سمندر سے ہے اس وقت وہ اپنی پاکیزہ اور عظیم محبت کے پہلو میں بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بلکہ اس کی باتوں کا شہد چکھ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں محمود کا ہر لفظ شہد کا قطرہ بن کر گر رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں کے پھولوں پر قتلی بن کر منڈلا رہی تھی۔ وہ اس کی آواز سن رہی تھی کیف آور اور بس

”اس نے آہستہ سے کہا“

سے بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم لوگوں کے جھوم میں کہیں غائب ہو گئے اور میری نگاہیں تمہیں تلاش کرتی رہ گئیں۔ تمہیں ڈھونڈتی رہ گئیں۔ میں تمہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ تم کہیں نظر نہ آئے۔

نرگس ایک لمحے کے لیے رک گئی

”پھر“

پھر میں نے تمہیں سمیر میں دیکھا اور میرا دل میرے حلق میں آ گیا، میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی۔ اس لیے کہ تم اب میرے لیے سب کچھ تھے۔ پھر دوسرے روز تم میرے بالکل قریب کھڑے اپنا مظہر نچوڑ رہے تھے اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں یقین کرنا چاہتی تھی کہ میرے خوابوں کا شہزادہ میرے قریب بالکل قریب کھڑا ہے مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”محمود نے پوچھا“

”کیوں“

ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں اور اگر ذرا بھی زبان کھولی تو فوراً آنکھ کھل جائے گی۔ سارا خواب ٹوٹ جائے گا اور سارا طلسم درہم برہم ہو جائے گا۔

”محمود جیسے خود بخود بولا“

”پھر“

پھر تم نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ محبت کی باتیں! اگرچہ ان میں محبت کا لفظ کہیں بھی نہ آتا تھا۔ پھر بھی ہر لفظ محبت کی خوشبو میں مہک رہا تھا۔ تم نے کہا تم مجھے پسند کرتے ہو اور میرے دل جیسے کسی نے اپنی گرم مٹھی میں لے لیا۔ میرا سارا جسم ایک ناقابل بیان کیف میں کھو گیا۔

”پھر کہو“

”محمود نے خواب ایسے عالم میں کہا“

کیا تم نے بھی کبھی خیال کیا تھا کہ ہم دونوں یہاں اکٹھے بیٹھ کر پیار کی داستان کا حرف آغاز لکھیں گے؟

”نرگس نے گہری آواز میں کہا“

”شاید میں نے زندگی کے ہر موڑ پر ایسا سوچا تھا۔“

”مگر تم تو مجھے جانتی بھی نہ تھیں۔“

”نرگس نے آنکھیں بند کر لیں۔“

میں تمہیں جنم جنم سے جانتی ہوں۔ ہر زمانے سے جانتی ہوں۔ میں نے تمہیں ہر دور میں دیکھا ہے۔ ہر خواب میں دیکھا ہے۔

”محمود نے حیرانگی سے پوچھا“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”نرگس نے کہا“

ایسا ہی ہوا ہے۔ محمود بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں اس گناہ سے نشیٹن پر کھڑے دیکھا تو میرا دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے جیسے میں اس سے پہلے بھی تمہیں کہیں مل چکی ہوں۔ کہاں؟ یہ نہ جانتی تھی دماغ پر زور ڈالنے سے بھی یہ معلوم نہ کر سکی۔

پھر تم میرے قریب آنے لگے۔ گاڑی آگے جا رہی تھی۔ اور تم میری طرف بڑی تیزی

ایسا لگا جیسے چنار کے درختوں کے درمیان پھولوں کی وادی میں جھولا جھول رہی ہوں۔ پھر تم چلے گئے تم مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے اور میں اپنی کھڑکی میں سے تمہیں جاتے ہوئے دور تک دیکھتی رہی۔

”محمود نے نرگس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔“

”مجھے چھوڑ نہ دینا، میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔“

اگر تم چل دیئے تو میری خوشبو اڑ جائے گی۔ ساری مہک ہوا ہو جائیگی اور میں ایک پڑ مردہ بتی بن کر زرد گھاس میں مل جاؤں گی۔

”محمود نے کہا۔“

میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا نرگس! تم میری زندگی میں چاند بن کر سدا چمکتی رہو گی تم میری زندگی کا سرمایہ ہو تم میری زندگی کا سکون ہو۔ جس طرح سمندر سے اس کی لہر کبھی جدا نہیں ہوتی، اسی طرح میں بھی تم سے کبھی جدا نہیں ہوں گا۔

”وعدہ کرتے ہو؟“

”پکا وعدہ۔“

نرگس محمود کے ساتھ لگ گئی اور اس نے اپنا سر اس کے چوڑے سینے میں چھپا دیا۔ اس وقت مشرقی درختوں کے اوپر نیلا چاند نمودار ہوا۔ اس کی چاندنی نے سارے جنگل کو منور کر دیا۔ یہ چاندنی سفید خرگوش کی طرح دبے پاؤں آکر بڑے آرام سے گھاس پر لیٹ گئی تھی۔ چاندنی میں درختوں کے سائے ان پر چھن چھن کر گرنے لگے۔ اب ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں جیسے خواب ایسے عالم میں ہولے ہولے جھومنے لگی تھی۔

”محمود نے کہا۔“

میں زندگی بھر تیری اور صرف تیری محبت کا دم بھروں گا نرگس! میں تمہیں زندگی کے کسی بھی موڑ پر تنہا نہ چھوڑوں گا۔ اور اگر کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنی زندگی بھی تم پر نچھاور کر دوں گا۔

”نرگس کا دل خوشی سے ڈوب گیا۔“

آہ! خدا کے لیے مجھے اتنی مسرت نہ دو کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔ اس قدر خوشی میری برداشت سے باہر ہے۔

اور اسکے ساتھ ہی نرگس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ محمود نے جلدی سے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا

رونا نہیں نرگس! ابھی تو ہنسنے کے دن ہیں۔ دیکھو چاند درختوں کے اوپر سے ہمیں کس پیار سے جھانک رہا ہے۔ وہ بھی ہماری خوشی کا برابر شریک ہے۔ بلکہ وہ ہمیں ہمارے اس ازلی اور ابدی ملاپ پر ہمیں مبارک باد دینے آیا ہے۔

نرگس نے آنسوؤں سے تر پلکیں اٹھا کر چاند کو دیکھا

مگر میرا چاند تو میرے پہلو میں ہے

اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑے۔ وہاں آکر پتہ چلا کہ نیلم سوچکی ہے سونے کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ نیلم اور نرگس تو خواب گاہ والے پلنگوں پر سوائیں اور محمود نے دوسرے بغلی کمرے میں ایک پلنگ پر اپنا بستر جمالیا تھا۔ نرگس خواب گاہ میں جا کر کپڑے بدلنے لگی۔ ساتھ والے پلنگ پر دوسری طرف نیلم لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ نرگس نے اسے جگانا مناسب خیال نہ کیا، اس کے خیال میں نیلم دن بھر کی تھکی

انتقام لے اور کیوں انتقام لے؟ آخر ان دونوں کا اس میں کیا تصور تھا؟

کچھ بھی ہو وہ محمود کی دل و جان سے گرویدہ ہو گئی تھی۔ وہ اس سے شادی نہ کرنا چاہتی تھی۔ صرف اس کی محبت چاہتی تھی۔ اس کا پریم چاہتی تھی۔ خواہ وہ ایک ہی دن کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نرگس سے اس کا محمود چھینے گی نہیں، مگر اس کے پیار میں سے اپنا حصہ ضرور لے گی؟

”محمود نے دروازہ بند کر لیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔“

کپڑے تبدیل کر کے اس نے رات کا لباس پہنا اور ٹیبل لیمپ جلا کر بستر پر لیٹ گیا اور ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے اندر بھی ایک قسم کی آگ سی سلگ رہی تھی۔ یہ انتقام کی آگ نہ تھی بلکہ پیار بڑے دوسرے قسم کے پیار کی آگ تھی۔

اس نے سگریٹ بجھا کر دوسرا سلگایا اور جلدی جلدی کش لینے لگا پھر وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک دوبارہ دروازے کے پاس آ کر رک گیا اور کان لگا کر کچھ سننے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ نیند میں نرگس کے پہلو بدم لے اور بڑبڑانے یا زور سے سانس لینے کی آواز سن سکے گا۔ مگر دوسری طرف گہری خاموشی طاری تھی۔

ایک بار دوسرے کمرے سے یوں سرسراہٹ کی سی آواز آئی جیسے کوئی ریشمی لحاف اوپر کھینچ رہا ہے۔ محمود کا جسم کانپ گیا۔ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔

اس نے سگریٹ کھڑکی کے باہر پھینکا، کھڑکی کو زور سے بند کر کے چٹخنی لگائی اور بستر میں

ماندی تھی اور اب بڑی گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ چنانچہ نرگس نے ہر ممکن یہ احتیاط کی کسی طرح کمرے میں شور نہ ہونے پائے۔ کپڑے تبدیل کر کے اس نے بالوں کو رومال میں باندھا۔ چہرے پر کولڈ کریم لگائی انگوٹھی، گھڑی، کانوں کے بندے اور گلے کا نیگلکس اتار کر میز پر رکھا اور لائٹ آف کر کے لحاف میں لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بتی کے گل ہوتے ہی نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ جاگ رہی تھی اس وقت سے جاگ رہی تھی جب سے وہ دونوں سیر کرنے کے لیے باہر گئے تھے۔ اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنا شروع کر دیا

”نیلم اس اندھیرے میں کیا سوچ رہی تھی؟“

وہ شام ہی سے بلکہ کئی روز ہی سے سوچ رہی تھی۔ بڑی بڑی خوفناک باتیں اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ شروع میں تو وہ ان باتوں سے ڈر گئی تھی، مگر اب اس نے صرف محمود کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ محمود سے اسے ایک طرح کا گہرا لگاؤ ہو گیا تھا۔

ظفر کی بے وفائی نے اس کے اندر ایک انتقام کی آگ بھڑکادی تھی۔ جو وقتی طور پر کچھ مدت کے لیے تو دبی رہتی تھی مگر کبھی کبھی ایک دم بھڑک اٹھا کرتی تھی۔ یہ خوفناک آگ تھی، انتقام کی آگ!!

وہ اب بھی اسی قسم کی آگ میں سلگ رہی تھی، مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کس سے

لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کتاب اٹھا کر پرے پھینک دی۔ لیپ کی بتی گل کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کے پونے گیارہ بجے ہوں گے کہ محمود کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور کوئی آہستہ سے دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

محمود کی فوراً آنکھ کھل گئی اس نے اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے میں کھڑکی کی طرف سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک سایہ سا محمود کے پلنگ کے پاس آ کر رک گیا۔

”محمود نے فوراً ٹیبل لیپ جلا دیا۔“

”کون“

”اس کا خیال تھا شاید نرگس ہوگی مگر اس کا خیال غلط نکلا“

”سامنے نیلم کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا“

”نیلم تم؟ اس وقت؟ کیا بات ہوگئی؟“

”کچھ نہیں“

نیلم نے ایک ہلکی سی سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور نیم جان سی ہو کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

محمود بھی اٹھ بیٹھا اور سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سگایا۔

نیند نہیں آرہی کیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟

ہاں بالکل ٹھیک ہے نیند نہیں آرہی تھی۔

محمود نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ نیلم کے اس طرح اچانک آدھی رات کو اس کے کمرے میں چلے آنے پر حیران بھی ہو رہا تھا اور خوش بھی تھا۔ حیران اس لیے ہو رہا تھا کہ اسے امید کس کی تھی اور آکون گئی۔ اور خوش اس لیے کہ بہر حال کوئی نہ کوئی تو آیا۔

مگر وہ نیلم سے اس قسم کی جرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس خیال سے کہ خبر نہیں نیلم کس مقصد کے لیے وہاں آئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ اسے اپنی بہن کی طرف سے آزمانا چاہتی ہو۔ اس لیے وہ خاموش تھا اور بڑی پراسرار اور مکار خاموشی کے ساتھ موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

”نیلم نے کہا“

میں تم سے ایک بات کرنے آئی ہوں محمود۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے کہ میں اس وقت آئی۔

کوئی بات نہیں نیلم! تم بلا جھجک جو کہنا ہے کہہ دو۔ میں پوری توجہ سے سنوں گا۔

محمود نے واقعی پوری توجہ سے کان کھول دیئے۔

”نیلم نے کہا“

میں تمہیں صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے؟

کیا ہو گیا ہے نیلم؟ محمود نے حیرانی سے پوچھا

”نیلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ سر جھکائے سرد آہیں بھرنے لگی۔ محمود کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے

شک سا ہوا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“

محمود! انسان کو پہاڑوں اور دریاؤں پر قابو حاصل ہو سکتا ہے، مگر دل پر کبھی قابو نہیں ڈالا جا

سکتا۔ یہ تم مانتے ہو نا؟

”محمود! اب معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔“

”تاہم اس نے انجان بننے ہوئے کہا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”نیلیم نے کہا اس کی آواز بڑی خشک اور ویران سی تھی۔“

”میرا مطلب ہے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں بڑی صاف گولڑکی ہوں۔ بڑی

سیدھی اور کھری ہوں۔ میں نے آج تک کسی سے دھوکا نہیں کیا۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو اور میں نے اس

بات کا اعتراف تمہارے سامنے کر لیا ہے۔“

اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ میرے اس اعتراف کے عوض تم مجھے عمر قید کی سزا دو یا اپنے

قدموں میں تھوڑی سی جگہ دے دو۔

محمود کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ تیرٹھیک نشانے پر ہی بیٹھا تھا بلکہ اس نے دو.....

گرائے تھے اور محمود تو شروع ہی سے ایک پراسرار شکاری تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر اسے

راکھدان میں مسل دیا۔ اور علم کی طرف دیکھ کر بولا۔

یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ بلا میں تمہیں عمر قید سزا کیوں دینے لگا۔ اور تو مجھے اس کا کوئی

اختیار ہی نہیں اور اگر اختیار ہو بھی مجھ سے میں ایسی نیک دل لڑکی کے ساتھ یہ ظلم کیسے کیا جاسکتا ہے۔

نیلیم کو بڑا حوصلہ ہوا۔ محمود کے اس آخری جملے نے اس کی خودداری اور خود پسندی کو اچھی

خاصی تقویت پہنچائی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

”تو کیا تم نے اس کا بُرا نہیں مانا؟“

”اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات ہے؟“

”نیلیم کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ محمود نے آہستہ سے نیلیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لیتے ہوئے کہا۔“

محبت کو چنار کے درخت کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر تھکا ماندہ مسافر اس کی چھاؤں میں آ کر

آرام کر سکے۔ اس کنوئیں کی طرح نہیں ہونا چاہیے جس میں گرا ہوا مینڈک پھر ذرا مشکل ہی سے

باہر نکل سکتا ہے؟

نیلیم نے محمود کا ہاتھ چوم لیا۔ محمود نے محسوس کیا کہ نیلیم کے ہونٹ گرم ہیں اور کپکپا رہے

ہیں۔ ایک ہی دن میں نیلیم کو اتنا بخار ہو جائے گا۔ محمود کو اس کی بالکل خبر نہ تھی۔ اس نے یونہی نیلیم کا دل

دیکھنے اور یہ محسوس کرانے کے لیے کہ وہ اپنی سہیلی کو کیا سمجھتی ہے اور محبت نے اسے اپنے فرائض سے

کتنی دور تک جا پھینکا ہے پوچھا

مگر نیلیم اگر نرگس کو اس کا علم ہو گیا تو تمہارا کیا خیال ہے وہ اسے کیا سمجھے گی۔

نیلیم کا منہ ایک دم بد مزہ سا ہو گیا۔ اس وقت اس نرگس کا نام بڑا بے موقع اور بے محل

محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کی بڑی پیاری سہیلی تھی مگر اس وقت وہ اسے بڑی بے درد محسوس ہو رہی تھی۔ اور

پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔

”اس نے ایک دم کہا۔“

تمہارے خیال میں اسے کیا سمجھنا چاہیے؟

”محمود نے کہا۔“

میرا خیال ہے کہ وہ یہی سمجھے گی کہ تم نے اس کے ساتھ دھوکا کیا اور اس کی محبت پر ڈاکہ ڈالا

”نیلیم چڑ گئی“

اگر وہ ایسا خیال کرے گی تو وہ اپنا مذاق خود بنائے گی۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی گرم کرنوں میں بیٹھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ دھوپ کو آج تک کوئی اپنے گھر میں قید نہیں کر سکا۔

”نیلیم نے بات بالکل سچی کہی تھی، لیکن زگس ایسا کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔“

میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں، محبت کو دھوپ کی طرح آزاد اور وسیع ہونا چاہیے۔ اب

میری طرف دیکھو

محمود نے سگریٹ سلاگالیا۔

مجھے زگس اچھی لگتی ہے اور مجھے تم بھی اچھی لگتی ہو اب یہ کس قدر ظلم ہے کہ میں صرف زگس

کو پیار کر سکوں اور تمہیں پیار تو درکنار تمہاری طرف جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکوں۔“

نیلیم کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ تیرا اپنے نشانے پر لگا تھا۔

تو کیا سچ مچ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟

”بالکل سچ مچ“

تم مذاق تو نہیں کر رہے؟

ارے کوئی ایسے میں مذاق کیوں کرنے لگا۔ یقیناً تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو اور میں نے

کئی بار تم سے محبت جتانے کا خیال کیا مگر ہر بار یہ سوچ کر چپکا ہو رہا کہ کہیں زگس کو برا محسوس نہ ہو۔

نیلیم ایک دم چڑ سی گئی۔

آخر اسے برا کیوں لگنے لگا۔ وہ میری سہیلی ہے ٹھیک ہے میں اس کا احترام کرتی ہوں۔ یہ

بھی ٹھیک ہے مگر اس کا کیا علاج کہ وہ تمہیں محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہو اور زگس کو یہ بات کسی صورت

بھی گوارا نہ ہو۔

”محمود نے کہا“

نیلیم! دراصل ہمارے یہاں کا ماحول ابھی اتنی آزادانہ محبت کے لیے ہموار نہیں ہے۔

ابھی یہاں کے لوگ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بڑے پرانے خیالات کے اسیر ہیں اور اپنے آپ کو

پرانی روایات سے نجات نہیں دلو سکتے۔ اس لیے ان لوگوں کی بات چھوڑ دو۔ ابھی ہمیں سینکڑوں

سال کی مدت درکار ہے کہ ہم محبت کو صرف محبت کے لیے کر سکیں۔ زگس اور نیلیم کے لیے نہ کر سکیں۔

”نیلیم نے کہا“

کیا ہم اتنی دیر انتظار کریں محمود؟

”محمود نے کہا“

اگر ہم نے انتظار کیا تو ہم زندہ نہ بچ سکیں گے۔ پھر ہماری موت یقینی ہے اس لیے ہمیں

اپنے آپ ہی اس بڑے اسرار مگر آزاد راہ گزر پر تنہا نکل پڑنا چاہیے۔

”نیلیم نے کہا“

کیا تم تیار ہو؟

”بالکل تیار ہوں۔“

اس کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک دوسرے سے بغل کیر ہو گئے۔

کھڑکی کے عقب میں آسمان کے مشرقی کناروں پر زرد چاند ٹوٹا پھوٹا سا دیران چاند نمودار ہو گیا اور

جنگلوں پر اس کے بے معلوم سی زرد زرد روشنی پھیلنے لگی۔

”اگلے روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔“

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نرگس اور نیلم نے محمود کے ساتھ چشموں پر جانے کا پروگرام بنایا اور وہ تینوں چھوٹی سی سیاہ کار میں بیٹھ کر چشموں کی طرف روانہ ہو پڑے۔ یہ جگہ شہر سے دس میل جنوب مشرق میں واقع تھی۔

آٹھ میل ادھر بستی میں ایک جگہ محمود نے کار کھڑی کر دی۔ وہاں سے کچھ پھل اور سگریٹ وغیرہ خرید کر کھیتوں میں سے گزر کر جانیوالی چھوٹی سی پگڈنڈی پر سے ہو کر یہ لوگ چشموں کے پاس پہنچ گئے۔

یہ چشمے بڑے ٹھنڈے اور میٹھے تھے۔ پتھروں کے درمیان شفاف پانی بڑی آہستگی کے ساتھ ریت پر بہہ رہا تھا۔ اوپر سال اور چیزھ کے درختوں کے جھنڈ تھے جن میں چڑیاں چہکاریں مچا رہی تھیں۔ یہاں ہواؤ کی رُکی سی تھی اور فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

محمود چشمے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور نرگس اور نیلم پھول توڑنے کے لیے ایک کھیت کی طرف بھاگ گئیں جہاں گلاب کے سرخ پھول دور ہی سے دکھائی دے رہے تھے۔

یہ پھول جنگلی تھے اور اپنے آپ ہی اگ کھڑے ہوتے تھے۔ اس لیے وہاں ان کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ محمود سگریٹ پیتے ہوئے ان دونوں کو کھیتوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ نیلم نرگس سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اگر وہ زیادہ سمجھدار نہ ہوتی تو یوں آسانی سے اپنی سہیلی کو دھوکا نہ دے جاتی۔ زیادہ عقل انسان کو بے حس بنا دیتی ہے۔ پھر اس کے سامنے سے اچھائی برائی کے عام معیار ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر عقل کی زیادتی اسے کافی حد تک گمراہ کر کے چھوڑتی ہے

تھوڑی دیر بعد نیلم بھاگتی ہوئی آتی دکھائی دی۔

قریب آ کر اس نے پھولوں سے بھری ہوئی جھولی گھاس پر الٹ دی

”ارے تم تو پورا کھیت اٹھا لائیں۔“

”مگر وہاں تو ابھی ہزاروں پھول ہیں“

”نرگس کہاں ہے“

”وہ ابھی پھول توڑ رہی ہے۔“

”کیسے خوبصورت پھول ہیں“

اور خوشبودار بھی، نیلم نے ایک پھول محمود کے ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ محمود نے محسوس کیا کہ پھول میں تازہ اور نیم گرم ہلکی سی مہک اٹھ رہی ہے۔ آسمان پر بادلوں کا رنگ گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

نیلم نے محمود کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا

”رات کا زیادہ اثر تو نہیں“

”کیا اثر؟ محمود نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے پوچھا“

”یہی کہ تم کہیں غلطی پر نہ ہو۔“

”محمود ہنس پڑا“

میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ میں اول تو کوئی کام کرتا ہی نہیں اور اگر اسے کر گزروں تو پھر

اس پر کبھی پچھتا یا نہیں۔ یہ شروع ہی سے میرا اصول رہا ہے۔

”نیلم بھی ہنس پڑی“

”تم واقعی بڑے دلچسپ ہو“

”تم بھی کم دلچسپ نہیں ہو“

محمود نے نیلم سے کہا جو اس وقت پھولوں کو جوڑ کر ان کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ نیلم کا رنگ بڑا نکھر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لغوی چمک اور مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔
اتنے میں سامنے سے زگس آتی دکھائی دی۔ محمود نے کہا

تمہاری سہیلی آرہی ہے۔

نیلم نے زگس کی طرف دیکھنے کی بجائے بڑے طنزیہ انداز میں محمود کی طرف دیکھا۔ اسے محمود کا یہ انداز بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ محمود اسے کبھی بھی یہ احساس دلائے کہ اس نے اپنی سہیلی کے ساتھ زیادتی کی ہے اس نے اسی لیے کل رات اس کے سامنے ہر بات کھول کر رکھ دی اور اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اپنی محبت کا برابر حصہ چاہتی ہے۔ اس بات پر محمود نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا۔ پھر اس قسم کی نشر زنی سے اس کا کیا مطلب تھا اس نے کہا

آئندہ سے مجھے ایسی بات نہ کہنا

”کیسی بات؟ محمود نے حیرانی سے پوچھا“

”یہی جو تم نے ابھی ابھی کہنے کی کوشش کی تھی۔“

”محمود ہنس پڑا“

”تم بڑی دہمی ہوئی جا رہی ہو“

نیلم کے دل میں یہ خیال بار بار آ رہا تھا اور اس خیال سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنا

بیچہانہ چھڑا سکی تھی۔ وہ خیال یہ تھا کہ محمود نے اتنی آسانی کے ساتھ نیلم کے ساتھ اظہار محبت کیوں کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زگس سے پیار نہیں کرتا تھا۔

یا اگر پیار کرتا تھا تو محض وقتی طور پر ایسا کر رہا تھا۔ اسے چاہیے کہ وہ زگس کی طرف سے اس کے حقوق کی کچھ تو حمایت کرتا۔ مگر وہ تو جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھ تھا۔ ادھر نیلم نے ذرا سا اظہار محبت کیا اور ادھر وہ جھٹ سے زگس کو خیر باد کہہ کر اس کی طرف اٹھ جاتا، لیکن نیلم اس موضوع پر زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اتنے میں زگس قریب آ گئی۔ نیلم سے کہا

”ہم نے تو سارا کھیت اجاڑ دیا ہے۔“

”زگس ہنسنے لگی“

”آخر پھول ہی تو ہیں۔ پھر سے اگ پڑیں گے۔“

محمود نے زگس کے ہاتھوں سے چند ایک تر و تازہ پھول لے کر انھیں بڑے مزے سے

سونگھا اور کہا

اس میں تمہاری محبت کی مہک اٹھ رہی ہے زگس! کہنے کو تو تم زگس ہو، مگر تمہاری خوشبو

گلاب میں بھی ہے

زگس شرما کر مسکرائی اور نیلم اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

اب آسمان پر بادل آہستی سے گرجا اور چند ایک بوندیں ان کے سروں پر گریں۔

میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ بارش نہ شروع ہو جائے۔

وہ جلدی جلدی وہاں سے اٹھ کر واپس چل پڑے۔ کار تک پہنچتے پہنچتے انھیں بارش نے آلیا اور وہ بارش میں بھیگ گئے۔ کار میں بیٹھ کر محمود نے گھر کا رخ کیا۔ راستہ میں بارش زیادہ ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو بارش مسلسل شروع ہو چکی تھی۔ اندر جا کر انھوں نے کپڑے تبدیل کیے۔ گرم گرم کافی نوش کی اور برآمدے میں کرسیاں ڈال کر آرام سے بیٹھ گئے۔ نیلم ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی اور نرگس اور محمود قریب قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

دوسرے روز انھوں نے بوریا بستر باندھا اور پروگرام کے مطابق واپس کوہ مری روانہ ہو گئے۔

مگر اتنی جلدی۔ ابھی تو کالج کھلنے میں دس دن باقی ہیں۔

سلمان نے کہا

بھئی یہ لوگ لاہور کے لیے اداس ہو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

لاہور

”اسی روز شام کو نرگس کی ساری فیملی لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔“

وہ رات انھوں نے ایک دفعہ پھر راولپنڈی میں بسر کی۔ چلتے ہوئے نرگس نے محمود کو روائی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اسے لاہور والے گھر اور کالج کا مکمل ایڈریس بھی دے دیا تھا۔ دوسری جانب نیلم نے بھی پنڈی والی کوشی کا پتہ دے ڈالا تھا۔ بلکہ محمود کو مجبور کیا تھا کہ وہ بھی پنڈی ساتھ ہی چلے، لیکن محمود نے دوسرے روز راولپنڈی پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ راولپنڈی میں ایک رات رکنے کے بعد نرگس اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ہمراہ لاہور آ گئی۔ اپنی کوشی میں آ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہاں آ کر اسے اپنا کمرہ بڑا اجنبی سا لگا۔

جیسے وہ ایک لمبی مدت کہیں پردیس میں گزارنے کے بعد وہاں آئی اصل میں یہ تبدیلی جذباتی تھی مقامی نہیں تھی۔ اسی دن سہ پہر کو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ ہمسائے میں وہی لڑکا ساتھ والی کوشی کی کھڑکی میں کھڑا ہے اور اسے کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

نرگس کو ایک دم محمود کا خیال آ گیا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔

محمود نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک ہفتہ بعد لاہور پہنچ جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کرے گا کہ اسے ملنے اس کے کالج آئے گا۔ کالج میں ملاقات کرنے کا طریقہ بھی نرگس نے اسے بتلا دیا تھا۔ چنانچہ اب وہ بڑے آرام سے اس روز کا انتظار کرنے لگی جب وہ کالج کے برآمدے میں محمود کو ٹھہلتے ہوئے دیکھے گی۔ دوسری طرف محمود راولپنڈی نیلم کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے نیلم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اسے ایک مقامی کالج کی ایک پروفیسر کے ذریعہ نیلم کو پیغام بھجوایا کہ وہ مری سے واپس آ گیا ہے۔ اور شام کو پلازا سینما کے لان میں اس کا انتظار کرے گا۔ نیلم پہلے ہی محمود کے اس دلنواز پیام کے انتظار میں تھی اور اس نے سینما جانے کا پروگرام بھی طے کر لیا تھا۔

اس شام کو نیلم نے اپنا بہترین لباس پہنا اور پلازا سینما کی طرف چل دی۔

سینما کے گیٹ پر ہی اس نے گاڑی واپس کر دی اور خود لان میں جا کر درختوں کے نیچے..... ہوئی..... آرام کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں سامنے سے محمود آتا دکھائی دیا۔

”میں دیر سے تو نہیں آ رہا نیلم؟“

اس نے آتے ہی اپنے مخصوص لمبے میں مسکراتے ہوئے کہا
نہیں تو۔۔۔۔۔ میں ہی ذرا پہلے آ گئی تھی۔

”میں سمجھا شاید میں ہی لیٹ ہوں“

اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ٹی شال پر چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے آئس کریم کھائی ادھر ادھر کی باتیں کیں اور ٹکٹ خرید کر باکس میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں وہ دونوں بالکل اکیلے تھے ان کا مقصد سینما دیکھنا تھا بلکہ ایک دوسرے سے پیار و محبت کی باتیں کرنا تھا۔ محمود نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

مری کی آب و ہوا تمہیں خوب راس آئی ہے۔

نیلم نے خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا

”وہ کیسے“

”وہ یوں کہ بڑی موٹی تازی ہو رہی ہو۔ چہرہ نکھر گیا ہے اور رنگ پہلے سے گورا ہو رہا ہے جیسا کہ ہر عورت تعریف سے خوش ہوتی ہے نیلم بھی اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئی۔ ایک عمر کے تجربوں نے محمود کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ عورت جب کسی ہتھیار سے بھی زیر نہ ہو تو تعریف آخری حربہ ہے جو عورت کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔

تم بھی تو موٹے تازے ہو رہے ہو۔

محمود ہنسنے لگا

”یہ اب بدلہ اتار رہی ہو؟“

اتنے میں گھنٹی ہوئی۔ سینما ہال میں اندھیرا ہو گیا اور سلائیڈز شروع ہو گئیں مگر ان دونوں کو سینما سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ محمود نے نیلم کو اپنی آغوش میں لے لیا اور پیار و محبت کی باتیں شروع ہو گئیں۔

جب انٹرول ہوا تو نیلم نے چاء پیتے ہوئے محمود سے کہا

”محمود! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں“

محمود سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا

”پوچھو“

اگر میں تم سے شادی کرنا چاہوں تو کیا تم کو کوئی اعتراض ہوگا؟

محمود ذرا نہ گھبرایا، بلکہ اسی اطمینان سے بولا

”یہ میری خوش قسمتی ہوگی نیلم“

نیلیم خوشی سے دیوانی سی ہو گئی۔ اسے بالکل خیال نہ تھا کہ محمود اتنی جلدی اس کی اسکیم پر لبیک کہہ دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یقیناً اس کی مخالفت کرے گا اور نرگس کے مستقبل کا سوال اٹھائے گا جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ مگر یہاں تو میدان بالکل صاف تھا۔ جہاں نیلیم کو محمود کے اثبات پر خوشی ہوئی وہاں دل میں یہ خیال بھی کھٹکا کہ محمود اتنی جلدی کیسے مان گیا؟

اس نے اتنی آسانی سے نرگس کو کیسے نظر انداز کر دیا۔

کہیں اس طرح ایک روز وہ نیلیم کو بھی تو نظر انداز نہ کر دے گا؟

مگر اس وقت وہ محبت کے جوش میں تھی اور اسے اس قسم کی افسوسناک تکلیف دہ باتیں سوچنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ اور نہ نرگس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت تھی۔

اس وقت تو اپنی محبت کی کامیابی پر پھولی نہ سار ہی تھی۔

کیا سچ مچ تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو؟ کہیں تم میرا دل رکھنے کے لیے تو ایسا نہیں کہہ رہے؟

”محمود ہنسنے لگا۔“

”میں تمہیں بالکل سچ کہہ رہا ہوں“

لیکن نرگس کا کیا ہوگا۔ کیا اسے تم نے بالکل بھلا دیا ہے؟

”محمود نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا“

”اسے بھلا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”نیلیم نے قدرے بے چینی سے پوچھا“

پھر اس کا کیا ہوگا؟

”محمود نے بڑے آرام سے کہا“

میں اسے برابر کا حصہ دوں گا، مگر اس سے شادی نہیں کروں گا، اس لیے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہوں بھی تو اس کے ماں باپ راضی نہ ہوں گے۔ ویسے میں نے شادی کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔

لیکن محمود! ایک روز مجھے بھی اسی طرح تو نہیں بھلا دو گے؟

پگلی محبت روز روز نہیں کی جاتی۔ ویسے تو انسان کی زندگی میں ہزاروں عورتیں آسکتی ہیں مگر وہ عورت جو زندگی میں داخل ہوتی ہے صرف ایک ہی ہوتی ہے۔

لیکن نرگس کو جب اس کا علم ہوگا تو اسے بے حد صدمہ پہنچے گا۔ عین ممکن ہے وہ اس غم کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے۔ یہ میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے۔

”محمود نے کہا“

تو پھر اس بات کا فیصلہ تمہیں کرنا ہوگا کہ آیا تم اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتی ہو یا نرگس کے لیے اپنی محبت کو قربان کر دینا چاہتی ہو۔ تمہیں ذرا سخت دل بننا ہوگا۔

وہاں ذرا دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ نیلیم اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔ اور محمود کچھ

سوچنے لگا۔ پھر بولا

دنیا میں ہر بات ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہو جائے تو زندگی کی ساری

رونق اور ساری ہماہمی ختم ہو جائے اور زندگی ایک لمبی اور سنسان سڑک میں تبدیل ہو جائے۔ یہاں

آکر ہمیں کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے اور پھر کچھ ناکامیوں کا غم بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی ایک شے

ہے جو زندگی کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

نیلیم نے سوچا کہ محمود بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ ڈالے۔ یہ زندگی اسے ایک ہی بار ملی ہے۔ یہاں اسے بار بار نہیں آنا۔ اگر اب کے اس نے زندگی کا پورا فائدہ نہ اٹھایا تو وہ حشر تک بچھتا کرے گی۔

اگر یہ زندگی اتنی مختصر اور اس قدر ناقابل اختیار ہے تو پھر کیوں نہ اسے اپنی مرضی کے مطابق ہنسی خوشی اور گلستان بن کر گزار جائے۔ کیا خبر کس موڑ پر اچانک موت سے منڈ بھیڑ ہو جائے۔

پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ایک دم ختم ہو جائے گا۔

نیلیم کا دل کانپ گیا۔ موت کے خیال کے ساتھ ہی اسے زندگی انتہائی خوبصورت نظر آنے لگی اور اس نے بے اختیار محمود کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

میں تمہاری باتوں پر عمل کروں گی محمود! جس طرح تم کہو گے اور اس طرح کر لوں گی۔ میں نرگس کو بھلا دوں گی اور صرف اپنی زندگی اور اپنا مستقبل سامنے رکھوں گی۔

مجھے تم سے یہی امید تھی

جب قلم ختم ہو گئی تو محمود اور وہ دونوں سینما ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر محمود نے نیلیم کو گاڑی میں بٹھلایا اور غیر معروف راستوں سے ہو کر اسے ان کی کوٹھی کی عقبی گلی میں چھوڑ دیا۔ انھوں نے دوسرے دن پھر ملنے کا وعدہ کیا اور جدا ہو گئے۔

پورے پانچ روز پنڈی میں گزارنے کے بعد محمود نے نیلیم سے اجازت لی اور لاہور کی طرف چل پڑا۔ راو پنڈی میں نیلیم نے کئی بار محمود کا گھر دیکھنے کی خواہش کی مگر محمود نے ہر بار اسے ٹال دیا۔

گھر میں بھی لوگ ہوں گے۔ ابھی تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔

مجھے لاہور سے ہوا آنے دو، پھر شادی کی بات چیت شروع کر دی جائے گی۔ میں وہاں سے والدہ کو ایک مفصل خط لکھوں گا جس میں تمام حالات لکھنے کے بعد تم لوگوں کا پتہ بھی بتا دوں گا۔ پھر وہ لوگ یہاں خود ہی پیغام لے کر تمہارے ہاں آجائیں گے۔

”نیلیم اس سے مطمئن ہو گئی تھی۔“

”نرگس کا کالج کھل چکا تھا۔“

اور وہ اب باقاعدہ کالج جانے لگی تھی۔ اسے ہر روز محمود کے خط کا انتظار رہتا تھا۔ آخر ایک دن محمود کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ منگل کی شام کو لاہور پہنچ رہا ہے اور بدھ وار کی صبح گیارہ بجے اس کے کالج آئے گا۔

اس روز نرگس نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا اور وہ صبح ہی سے محمود کا انتظار کرنے لگی۔ نرگس جس کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی وہ لڑکوں اور لڑکیوں کا ملا جلا کالج تھا اور شہر سے کافی دور ایک ندی کے کنارے بڑی پر فضا جگہ پر واقع تھا۔ یہاں اونچے اونچے گنجان درخت تھے۔ سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ہرے بھرے گھاس سے لہلہاتے ہوئے لان تھے۔ درختوں کے نیچے بچھے ہوئے خوبصورت بیچ تھے۔ دیواروں پر عشق پیچاں کی پھولوں بھری بنیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے کے بعد خالی پیریڈ میں نرگس نے کالج کے برآمدے کے قریب محمود کے انتظار میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ گیٹ ک طرف سے آنے والی چھوٹی سی سڑک پر محمود نمودار ہوا۔

زگس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ قریب آ کر محمود نے اپنے خاص انداز میں زگس کو سلام کیا اور دونوں وہاں سے چل پڑے۔ وہ باغ کی چھوٹی چھوٹی روشوں پر سے گزرتے ہوئے ندی کی طرف جانے والی چھوٹی سی سنسان سڑک پر آ گئے۔

”میں تو سمجھی تھی کہ شاید تم راولپنڈی میں رہ جاؤ“

”محمود نے پوچھا“

”کیوں بھلا“

اتنی دیر تک خط جو نہ لکھا

محمود ذرا مطمئن سا ہو گیا۔

ارے خط لکھنے میں تو تم جانتی ہی ہو کہ میں بڑا است واقع ہوا ہوں۔ کئی بار ارادہ کیا کہ تمہیں خط لکھوں۔ پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ جس روز وہاں سے چلنا ہوگا اُس روز خط لکھیں گے۔

”زگس نے کہا۔“

اور ادھر میرا جو حال ہوا اس کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی پرواہ نہیں۔“

محمود نے کہا

”غصے کیوں ہوتی ہو زگس! بھلا تمہاری پرواہ کیے بغیر میں زندہ کیسے رہ سکتا ہوں۔

تم اب جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔

جھوٹ بولنے والے کا سر کالا

اس پر زگس کھکھلا کر ہنس پڑی۔ کیونکہ ان دونوں کے سر سنہری تھے اور آنکھیں نیلی تھیں۔

اب وہ ندی کے قریب آ گئے تھے۔ ندی میں پانی بڑی ہموار نرمی اور آہستگی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی اور اس میں پانی جھلملارہا تھا۔

اب یہاں بھی خنکی ہو چکی تھی۔ موسم کافی بدل گیا تھا۔ زگس نے کہا

میرا خیال ہے کہ یہاں بیٹھنے کی بجائے کسی دوسری جگہ چلا جائے۔

محمود نے جلدی سے کہا

کیا خیال ہے اگر شیراز میں چاء پی جائے“

بڑا اچھا خیال ہے، لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

تم ہر وقت اس کا فکر مت کرتی رہا کرو۔

کیا کروں اگر فکر نہ کروں سب لوگوں کے ساتھ جو رہتی ہوں۔ محمود نے سگریٹ ندی میں

پھینک دیا۔

میری گاڑی ان درختوں میں کھڑی ہے یہاں سے فوراً بھاگتے ہیں اور مال پر جا کر دم

لیتے ہیں۔ وہاں گاڑی سے نکل کر سید حاشیزان کی بالکونی میں چلے جائیں گے اور کسی کو آنکھوں آنکھ

خبر تک نہ ہوگی۔

اور ہوا بھی ایسا ہی

وہاں سے دونوں گاڑی میں بیٹھ کر سید حاشیزان کے باہر پہنچ کر رک گئے وہاں سے نکل کر

سید حاشیزان کی بالکونی میں جا کر انھوں نے دم لیا۔ اس اثنا میں کسی ایسے آدمی نے ان دونوں کو نہ

دیکھا جو ان کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں چائے آگئی اور وہ دونوں وہاں چاء پینے اور باتیں کرنے میں

مشغول ہو گئے۔ محمود نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

زرگس! ایک بات پوچھوں؟

زرگس چاء کا پہلا گھونٹ پی رہی تھی۔ اس نے کہا

ضرور پوچھو

کیا تم مجھ سے واقعی بہت محبت کرتی ہو؟

زرگس اس کا جواب دینے کی بجائے شرما گئی اور اس نے گردن جھکالی

اونہوہ! بھی ایسی بات نہیں۔ مجھے صاف صاف لفظوں میں بتاؤ۔“

کیا تمہیں اس میں شک ہے؟ زرگس نے نظریں اٹھا کر کہا۔

شک تو کبھی نہیں ہو سکتا زرگس

”پھر“

در اصل بات یہ ہے کہ میں تمہاری زبان سے محبت کا اقرار سننا چاہتا ہوں

تو سنو زرگس نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا

میں تم سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ ایسی محبت جو ستاروں میں رہتی ہے اور جس کا مسکن

انسانی ادراک کی سرحدوں سے پرے ہے۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے دل میں محبت کا شعلہ بھڑک رہا

ہے اور میرے سارے جسم کو اس میں جلانے ڈال رہا ہے۔ اگر تمہیں اب بھی شک ہے تو پھر دیکھ لینا

ایک دن میں تم پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔

بس بس زرگس! ایسی بات نہ کہو

”محمود نے زرگس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا“

مجھے تم پر یقین ہے بہت زیادہ یقین ہے۔ میں تو تم سے یونہی مذاق کر رہا تھا۔

زرگس کا دل مطمئن سا ہو گیا۔ وہ بے چین سی ہو گئی تھی اسے خواہ مخواہ وہم سا ہونے لگا تھا

کہ محمود کو اس کی محبت پر اعتماد نہیں رہا۔ چنانچہ اگر وہ روک نہ دیتا تو زرگس اپنی محبت کو سچا ثابت کرنے

کے لیے اس سے آگے گزر جاتی۔ پھر وہ سنجیدگی سے بولی

ہاں کبھی کبھی ایک خیال مجھے پریشان کر دیتا ہے۔

کون سا خیال؟ محمود نے پوچھا

یہی کہ ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا۔ کیا ہم عمر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر

کریں گے یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ترپنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں گے۔

محمود ذرا پریشان سا ہو گیا۔ اصل میں وہ اس موضوع پر زرگس سے کبھی بات نہ کرنا چاہتا

تھا۔ یہی ایک موضوع تھا جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ ناپسند تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی سے

سگریٹ سلگالیا اور جلدی جلدی اس کے کش لینے لگا۔

زرگس بولے جارہی تھی۔

جب میں تمہارے بغیر بسر ہونے والی زندگی کا تصور کرتی ہوں تو مجھے ہر طرف ویران

کھنڈرات اور اجڑے ہوئے باغات کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے، جو حدنگاہ تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے،

لیکن جب زندگی کو تمہارے سائے میں بسر ہوتے دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے بہاریں

بکھر جاتی ہیں۔

زرگس ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئی۔ پھر خود ہی بولی

کبھی تم نے بھی اس طرح سوچا ہے محمود؟

اب محمود کو بولنا ہی پڑا تھا۔

ہاں ہاں کیوں نہیں! اس نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا
کیوں نہیں! میں بھی چاہتا ہوں کہ تمہارا ساتھ زندگی بھر کا ساتھ ثابت ہو۔
لیکن یہ کیسے ہوگا کبھی اس پر غور کیا؟

کیوں نہیں! ظاہر ہے ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔
مگر ایسا کیوں کر ہو سکے گا۔

ایک ہی صورت ہے کہ ہم لوگ تمہارے گھر میں پیغام بھجوائیں؟
لیکن کب؟

نرگس محمود نے لمبا سامنہ بنا کر کہا تم جانتی ہو کہ یہ میرا آخری سال ہے۔
شادی کی بات چیت اس وقت تک شروع نہیں کی جاسکتی جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہو جائے۔ میں تو
چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تمہیں اپنے گھر لے آؤں۔ مگر ابھی ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔
پھر یہی کہ ہمیں مجبوراً ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک سال بھی نہیں تین ماہ تو گزر
ہی گئے ہیں۔

نرگس خاموش ہو گئی۔ اس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

محمود نے نرگس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا

”کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟“

اپنے سے زیادہ اعتماد ہے

”نرگس نے بڑی گہری اور پختہ آواز میں کہا۔ اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھے اور

ہوٹل سے باہر نکل آئے۔“

☆☆☆☆☆

بدنامی

جس روز شام کے وقت نرگس اور محمود دونوں شیراز سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ رہے
تھے ٹھیک اسی وقت نرگس کے والد کا ایک قریبی دوست شیخ حشمت علی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بھی
ساتھ والی دوکان سے کچھ خرید و فروخت کے بعد باہر نکل رہا تھا۔ اس سے بیشتر بھی وہ ان دونوں کو
ایبٹ آباد میں دیکھ چکا تھا مگر جہانگیر بھٹہ نے مصلحتاً خواجہ صاب سے اس سلسلہ میں کبھی کوئی
بات نہ کی تھی۔

مگر اس روز پھر ان دونوں کو ایک ساتھ ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کر لیا
کہ وہ اس بارے میں اپنے بچپن کے دوست کو ضرور آگاہ کر دیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو وہ
گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے نرگس کے والد کے ہاں آ گئے۔

اس وقت نرگس برآمدے میں آرام کرسی پر گرم کوٹ پہنے بیٹھی تھی اور کسی انگریزی
رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس نے شیخ حشمت علی کو اندر آتے دیکھ کر اسلام کیا

”آداب عرض چچا جان۔ آج آپ کیسے بھول پڑے“

شیخ صاحب مسکرائے

آداب عرض بیٹی بس ذرا تمہارے ابا جان سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔ کئی روز سے

پروگرام بتا رہا تھا۔ آج چل پڑا

برآمدے میں کھڑے ہو کر انھوں نے اپنا چشمہ صاف کیا اور کوٹ کے اوپر والا مفلرا چھی طرح درست کیا اور پوچھا

تمہارے اباجی کہاں ہوں گے؟
جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں
”جیتی رہو بیٹی“

اس کے بعد وہ نرگس کے والد کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

نرگس کے والد خواجہ صاحب اپنے کمرے میں صوفے میں کبل اوڑھے دھنسنے ہوئے تھے اور پرانے انگریزی اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ شیخ صاحب کے آمد کی توقع میں تھے۔

انھوں نے شیخ صاحب کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اخبار میز پر رکھ دیا اور عینک اتار کر ڈبی میں بند کر دی۔

تم نے دیر کر دی یار“

شیخ حشمت علی نے اوور کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر رکھ دیا اور آرام سے کرسی کھینچ کر خواجہ کے قریب آ گئے۔

بھئی کار بھی میری طرح بوڑھی ہو گئی ہے۔ دو قدم چلی ہے تو دم لینے کے لیے رک جاتی ہے۔

”خواجہ ہنس پڑے“

حشی یار! تمہاری ظریفانہ باتیں نہ گئیں۔ کبھی کبھی مجھے تمہاری زندہ دلی پر بڑا رشک آتا ہے۔ اتنی عمر میں بھی تم نے اپنی طبعی ظرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

کیوں بھئی! یہ بچپن سال کی عمر کوئی زیادہ عمر تو نہیں“

خواجہ صاحب نے کہا

بھئی تمہاری عمر میں تو لوگ حج کر کے محکف ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔
وہ کوئی اور ہوں گے۔ ہم ان سے نہیں ہیں
خواجہ صاحب نے جھٹ گرہ لگائی۔

یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم اس مٹی سے نہیں بنے

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ یونیورسٹی کے انتخابات کی باتیں، ملک کی سیاسی صورت حال پر تبصرہ ہوا، مغربی سیاست پر تھوڑی بہت گفتگوں ہوئی آخر شیخ صاحب نے موضوع بدلا۔

کیوں میاں! کچھ لڑکیوں کی شادی کا بھی سوچا ہے یا نہیں

خواجہ صاحب ذرا چونک سے گئے۔ پھر سنبھل کر بولے۔

”بھئی چھوٹی لڑکی کی تو کم عمر ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اور بڑی بیٹی؟

وہ تو ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

شیخ صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا

یار بُرا نہ ماننا! مجھے یہ نئی طرز کی تعلیم کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔

وہ کیوں؟

اس میں عورتوں کو کچھ زیادہ آزادی مل جاتی ہے جو ہمارے مزاج کے خلاف ہے۔

خواجہ صاحب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”کیا مطلب؟“

شیخ صاحب نے فوراً کہا

میرا مطلب یہ ہے کہ آجکل کے کالجوں میں جو تعلیم عام ہے۔ اس کا ہماری بچیوں پر اچھا

اثر نہیں پڑ رہا۔

خواجہ صاحب کو ابھی تک وہم بھی نہ تھا کہ شیخ صاحب انھیں کیا ”خوشخبری سنانے آئے

ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بحث کے موڈ میں فرمایا

”اس میں خرابی کیا ہے۔ تم لوگ واقعی پرانے خیال کے لوگ ہو۔ تم زمانہ کی ترقی کے

ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ وقت تو کبھی کسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمہیں خبر ہی نہیں کہ زمانہ کہاں سے

کہاں پہنچ گیا ہے۔

”شیخ صاحب نے فوراً بات کہہ دی“

یہی تو مصیبت ہے کہ مجھے خبر ہے زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

”خواجہ صاحب نے کہا“

ارے بھی! تمہیں بالکل خبر نہیں

شیخ صاحب نے گہری آواز میں کہا

مجھے ہر بات کی خبر ہے خواجہ! اور یہی تمہیں بتانے آیا ہوں کہ وقت گزر رہا ہے۔ تیزی سے

گزر رہا ہے اور تم اپنی خواب گاہ میں بیٹھے پرانے اخبارات کا مطالعہ کر رہے ہو۔

خواجہ صاحب ذرا ٹھٹکے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خیال میں بھی کوئی ایسی ویسی بات نہ

آسکتی تھی۔ مگر جب شیخ حشمت علی نے انھیں کھلے اور صاف صاف لفظوں میں ساری حکایت سنائی تو

خواجہ صاحب جیسے سکتے میں آ گئے۔ وہ ایک دم چپ ہو گئے اور گہری سوچ میں کھو گئے۔ لیکن چونکہ

آدمی ذرا آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ اس لیے زیادہ گھبرائے نہیں بلکہ بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ

حالات پر غور کرنے لگے۔ شیخ حشمت علی نے کہا

”ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ ابھی دن کا آدھا حصہ باقی ہے۔ ابھی سورج ڈھلنا شروع

نہیں ہوا تم میرے جگری دوست ہو۔

تمہاری بیٹی میری بیٹی ہے اور مجھے جو بات ناپسند تھی میں نے تمہارے سامنے اسے صاف

لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا۔

اس کے بعد شیخ حشمت علی اٹھ کر چلنے لگے تو خواجہ صاحب نے انھیں روک لیا۔

”ابھی ذرا ٹھہر جاؤ۔“

”شیخ صاحب پھر بیٹھ گئے۔“

مجھے بتاؤ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟

مجھ سے پوچھتے ہو، جیسے تمہیں علم ہی نہیں۔ بھی لڑکی کی فوراً کہیں شادی کر دو۔ شریف

باپ ایسے حالات میں یہی کچھ کر سکتا ہے۔ خواجہ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

مگر حشمت وہ ابھی پڑھ رہی ہے اس کا مستقبل تباہ ہو جائیگا۔

”شیخ صاحب نے کہا“

اور اگر اس کا مستقبل سنوارتے اپنی عزت خاک میں ملا بیٹھے تو؟ پھر کیا کرو گے؟

ایسا نہ کہوشمی! میری بچی ایسی نہیں۔ مجھے اپنی تربیت پر بھی اعتماد ہے پورا اعتماد ہے۔

”تو پھر میں چلتا ہوں جو تمہارے جی میں آئے کرو“

”اس کے بعد شیخ حشمت علی وہاں سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔“

”خواجہ صاحبہ صوفے پر بیٹھے گہرے فکر میں گم ہو گئے۔“

انھیں نرگس سے بہت پیار تھا۔ بے حد محبت تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں نرگس پر پورا بھروسہ تھا۔ انھیں اس بات میں کوئی خاص برائی نظر نہیں آرہی تھی کہ نرگس کو کسی سے پیار ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس معاملے میں بڑے روشن خیال بزرگ تھے۔ انھیں اگر خطرہ تھا تو صرف یہ کہ وہ نوجوان جس سے نرگس محبت کر رہی ہے۔ کہیں اس بھولی بھالی لڑکی کو ورغلا کر اس کی زندگی تباہ نہ کر دے۔

انھیں نرگس کی شرافت پر تو پورا بھروسہ تھا۔ مگر اس لڑکے پر اعتماد نہیں تھا۔ انھوں نے آہستہ سے اخبارات کا پلندہ اٹھا کر الماری میں رکھا اور سیلپر پہن کر باہر لان میں آ گئے۔

برآمدے میں بجلی کی روشنی میں نرگس ابھی تک انگریزی رسالوں کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اس کے والد نے کہا

”سردی نہیں لگ رہی بیٹی۔ اندر جا کر پڑھو۔ یہاں تو سردی ہو گئی ہے۔“

نرگس سنبھل کر بیٹھی

”بہت اچھا ابا جان بس اندر جا ہی رہی تھی۔“

اس کے ساتھ ہی نرگس رسالے سنبھال کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔

خواجہ صاحب کے دل میں اس بات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ کس قدر اچھی اور فرمانبردار لڑکی ہے۔ بھلا ایسی لڑکی کبھی خاندان کی عزت خراب کر سکتی ہے۔

”کبھی نہیں! کبھی نہیں!!“

خواجہ صاحب بے خیالی کے عالم میں برآمدے میں ٹہلنے لگے اور اس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک کہ خادمہ نے آکر اطلاع نہ دی کہ کھانا لگادیا گیا ہے۔ کھانے پر بھی خواجہ صاحب نے زیادہ بات چیت نہ کی۔ بلکہ زیادہ عرصہ خاموش رہے اور اندر ہی اندر کسی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہے نرگس کا ماتھا کسی حد تک ٹھنک گیا تھا۔

کیونکہ جب سے شیخ صاحب تشریف لائے تھے والد صاحب چپ چاپ ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں بھی طرح طرح کے وہم چکر لگانے لگے تھے مگر وہ ان کے بارے میں پوری طرح کھل کر سوچتے ہوئے ڈرتی تھی۔ آخر اس کا شک یقین میں بدل گیا جب کھانے کے بعد ملازمہ نے آکر نرگس سے کہا

”بیٹی تمہیں بڑے حضور نے یاد کیا ہے۔“

”نرگس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے“

”ابا جان کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں“

نرگس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دل پر ہاتھ رکھ کر خدا کا نام لیتی اپنے والد صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔

خواجہ صاحب اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ عینک چڑھا رکھی تھی اور ہولے ہولے سگار پی رہے تھے۔ نرگس کو خوب یاد تھا کہ اس کے ابا جان عام طور پر بڑے فکر خیز لحاظ میں سگار پیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو حالات کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار کر لیا۔ اسے اپنی معصومیت کا پورا یقین تھا اور اسے اس بات پر بھی ناز تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی عزت

اور خاموش بیٹھی رہی۔ سستی رہی۔۔۔! جب خواجہ صاحب اپنی بات ختم کر چکے تو انھوں نے پوچھا۔

کیا یہ سچ ہے میری بچی؟

نرگس نے آہستہ سے کہا

یہ سچ ہے ابا جان کہ میں نے اپنی شادی کے لیے ایک خاوند کو جن لیا ہے۔ مگر یہ جھوٹ ہے کہ میں نے اس سے زیادہ ایک قدم بھی آگے بڑھایا ہو۔ یا یہ کہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہو کہ میں آپ کے مشورہ کے بغیر ایک قدم بھی اٹھاؤں گی۔

خواجہ صاحب نے نرگس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا

مجھے تم سے یہی امید تھی میری بچی۔ لیکن میں ایک بات تم سے ضرور کہوں گا۔

فرمائیے ابا جان

خواجہ صاحب پھر ٹہلنے لگے۔ انھوں نے کہا

میں نہیں چاہتا کہ اب تم اس لڑکے سے کہیں ملو۔ اس لیے کہ اگر تم جیسا کہ تم نے کہا ہے وہاں شادی کرنا چاہتی ہو تو یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں دے دو۔ ہم اپنے طور پر اسے شروع کریں گے اور یقین کرو۔ وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ تم لڑکے کے خاندان اور دوسری ضروری باتوں کے بارے میں اپنی والدہ سے بات چیت کر لو۔ میں ان سے دریافت کرنے کے بعد شایان شان طریقے سے بات شروع کر دوں گا۔ ابھی اس کی کسی کوکانوں کان خبر نہیں میری بچی! بیشتر اس کے کہ سارے شہر میں شور مچ جائے میں اسے بڑے شریفانہ طریقے سے انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

اب تم جاسکتی ہو میری بچی!

جب نرگس جانے لگی تو خواجہ صاحب نے کہا

اور سنو

نرگس ایک دم رک گئی

رات کو زیادہ دیر تک مت پڑھا کرو۔ جلدی سو جایا کرو۔ نرگس بہت اچھا ابا جان کہہ کر ایک دم باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کے حضور میں سجدہ شکرانہ ادا کیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بات اتنی خوبصورتی اور آسانی سے طے ہو جائے گی۔ اس نے فوراً نیلیم کو صورت حال کے بارے میں ایک خط لکھا اور خادمہ کے حوالے کر دیا۔

دوسرے روز تیسرے پہر جب کالج میں چھٹی ہوئی تو محمود کالج کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ وہ نرگس کا انتظار کر رہا تھا۔

نرگس نے اسے اس طرح کھڑے دیکھا تو سہم سی گئی۔ کیونکہ اسے اپنے والد سے کئے ہوئے وعدہ کا بہت احترام تھا۔ وہ اپنے ابا جان کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر اب جبکہ محمود بالکل سامنے کھڑا تھا اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔ ویسے بھی نرگس محمود کو رات کی ملاقات کا ایک ایک لفظ بتانے کے لیے بے تاب تھی۔ چنانچہ وہ دونوں ایک کیفے کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔

نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا

آج ایک بہت بڑی خوشخبری لائی ہوں محمود؟

کوئی خوش خبری؟

محمود نے جلدی سے پوچھا

ابا جان میری شادی تمہارے ساتھ کرنے پر راضی ہو گئے ہیں

سچ؟ محمود نے جلدی سے پوچھا۔ نرگس نے کہا

بالکل سچ! انہوں نے تمہارے ابا جان کا ایڈریس بھی مانگا ہے۔ وہ شادی کی بات چیت

براہ راست شروع کرنا چاہتے ہیں۔

محمود نے اگرچہ بہت عقل مندی اور تجربہ کاری سے کام لیا مگر اس کا چہرہ قدرے اتر سا

گیا اور وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی پریشانی اور گھبراہٹ کا بالکل نہ

چھپا سکا۔

نرگس نے جلدی سے پوچھا

کیا بات ہے محمود؟ تم پریشان کیوں ہو

محمود نے جلدی سے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا

کچھ نہیں، آج ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔

”لاؤ میں دبا دوں“

نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں، ابھی چاء پی کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد اس نے زور سے ہیرے کو آواز دی۔

جب وہاں چائے آگئی تو نرگس نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا

اب کتنا اچھا ہو گا محمود! ہماری شادی ہو جائے گی۔ جس سفر کو ہم اس قدر دشوار گزار سمجھ

رہے تھے وہ کسی قدر آسانی سے طے ہو گیا ہے۔

محمود نے کہا

جب طے ہو گا تب جانیں گے

نرگس نے جلدی سے پوچھا

کیوں؟ ایسا کیوں کہتے ہو۔ اب تو ہر بات ٹھیک ہو گئی ہے۔ سب سے بڑی بات ابا

جان کی تھی وہ مان گئے ہیں۔ اب اس میں کیا رکاوٹ ہے۔ کیا تمہارے ماں باپ نہ مانیں گے۔ مگر تم

نے تو کہا تھا کہ وہ ہر حالت میں اس رشتے کے لیے تیار ہیں“

”کیا ایسا نہیں ہے محمود؟“

میرا یہ مطلب نہیں نرگس ڈار لنگ؟

پھر کیا مقصد ہے؟ خدا کے لیے جلدی بتاؤ

محمود ہنسنے لگا

ارے پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا کرے یہ شادی ہو

جائے۔ مگر ہمیں ہر حالت میں اپنی جدوجہد کو برقرار رکھنا چاہیے۔

وہ تو ہم کریں گے ہی

بس میرا یہی مطلب تھا

نرگس نے پوچھا

تو پھر تم اپنے ابا جان کا موجودہ پتہ مجھے دے دو تا کہ میں آج شام امی جان کو جا کر وہ پتہ

بتلا دوں۔

محمود نے مسکراتے ہوئے کہا

ارے بھئی اتنی بے تاب کیوں ہونے لگیں۔ ذرا چائے تو پی لینے دو۔

نرگس مسکرانے لگی

کیا کروں محمود! تم جانتے میں تم سے کس قدر پیار کرتی ہوں۔ میں تمہارے لیے اپنی تعلیم کو ختم کر رہی ہوں۔ مجھے ایم اے کی ڈگری نہیں چاہیے۔ مجھے صرف محمود چاہیے۔ جب محمود مل گیا تو مجھے دنیا کی ساری خوشیاں، ساری ڈگریاں مل جائیں گی

دونوں ہنسنے لگے اور چائے پیتے ہوئے گرم جوشی سے باتیں کرنے لگے۔
جب چائے ختم ہو گئی اور وہاں سے گاڑی میں سوار ہو گئے نرگس نے کہا
مگر ایڈریس تو تم نے دیا ہی نہیں؟
محمود نے کہا

دراصل میرے والد صاحب ان دنوں یہاں نہیں ہیں
وہ کہاں ہیں۔ نرگس نے بدحواسی میں پوچھا
دلی گئے ہوئے ہیں۔ بس اگلے ہفتے تک آجائیں گے پھر میں تمہیں پورا ایڈریس دے
دوں گا اور سب کام ٹھیک ہو جائیگا۔

نرگس نے ایک جگہ پہنچ کر کہا

مجھے یہیں اتار دو محمود! اب ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے ابا جان نے کہا تھا کہ اب مجھے تم سے زیادہ میل ملاپ نہیں رکھنا چاہیے۔
جیسی تمہاری مرضی نرگس۔ لیکن کب ملو گی؟
پھر کسی دن محمود! لیکن اتنی جلدی نہیں

اس کے بعد محمود اور نرگس مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

نیلیم کو جب نرگس کا خط ملا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

وہ یہ پڑھ کر حیران رہ گئی کہ نرگس اور محمود کی شادی کی منظوری چچا جان نے دے دی ہے۔
اسے یہ کسی طرح بھی امید نہ تھی۔ سب سے زیادہ خیال اسے محمود کا تھا کہ اس نے یہ کیا کر دیا۔ اس نے
نیلیم سے بیاہ کا وعدہ کیا تھا۔

نیلیم بے حد پریشان ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اگلے ہی روز بہانہ بنایا اور بڑے بھائی کے
ساتھ چھٹی لے کر راولپنڈی سے لاہور روانہ ہو گئی۔

خاردار جھاڑیاں

”جس وقت نیلم لاہور پہنچی نرگس کالج گئی ہوئی تھی۔“

واپسی پر وہ نیلم کو دیکھ کر پہلے تو حیران رہ گئی اور پھر اس نے خوشی سے دیوانہ وار اسے اپنے

گلے لگالیا۔

”تم کب آئیں؟ خط بھی نہ لکھا“

”نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا“

”تمہیں شادی کی مبارک باد دینے آئی ہوں“

”نرگس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا“

”آہستہ نیلی! آہستہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا“

”اس کے بعد دونوں ہنستی ہوئیں اندر چلی گئیں۔“

رات کو بیٹھ کر دونوں سہیلیوں نے جی کھول کر باتیں کیں۔ نرگس بڑی خوشی اور دلی

مسرت کے ساتھ ایک ایک بات کو بار بار دہرا رہی تھی اور نیلم گہرے فکر مندانہ انداز میں اس کی

باتیں سن رہی تھی۔

اوپر ہی اوپر وہ مسکرا رہی تھی اور نرگس کی خوشیوں میں برابر کی شریک ہو رہی تھی۔ مگر دل ہی

دل میں وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے نرگس سے محمود کے ہوٹل کا ایڈریس معلوم کیا اور دوسرے ہی

روز وہاں چل پڑی۔

”اس نے تانگہ لیا اور یونگ ہال کی طرف آگئی۔“

یونگ ہال کے باہر تانگہ کھڑا کر کے اس نے تانگے والے کو رخصت کیا اور خود اس کے

دروازے میں سے اندر داخل ہو کر برآمدے میں آگئی۔

یہاں ایک چوکیدار سے اس نے پوچھا کہ جس نمبر کا اسے کمرہ چاہیے اس کا ونگ کس

طرف ہے۔ چوکیدار نے چپراسی سے پوچھ کر اسے بتا دیا۔ چنانچہ نیلم ہال کی سیڑھیاں طے کرنے

لگی۔

دوسری منزل پر مشرقی دنگ میں پہنچ کر اس نے ایک کمرے کے باہر محمود کا نام لکھا ہوا

دیکھا، مگر بد قسمتی سے وہاں تالا لگا ہوا تھا۔

نیلم کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ محمود

صاحب کہاں ہیں اور کب آئیں گے، لڑکے نے بڑے مہذب انداز میں بتایا کہ محمود ابھی

دروازہ بند کر کے انارکلی تک کچھ خرید و فروخت کے لیے گیا ہے اور ابھی آجائے گا۔

”شاید دیر سے آئیں“

”لڑکے نے کہا“

جی نہیں وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ جلدی آجاؤں گا۔ آپ اتنی دیر کا من روم میں انتظار

کریں۔ چنانچہ نیلم کا من روم میں آ کر بیٹھ گئی۔

آدھ گھنٹے بعد ایک چوکیدار نے آ کر اطلاع دی کہ محمود صاحب ابھی ابھی اوپر گئے ہیں۔

نیلم جلدی سے اٹھی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ محمود کے کمرے کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا

کہ کمرہ کھلا تھا، مگر پردہ گرا ہوا تھا۔

”نیلم نے آہستہ سے پردہ پرے سرکا دیا اور اندر داخل ہو گئی۔“

”نیلم کو سامنے دیکھ کر محمود حیران رہ گیا۔“

”تم نیلم؟ تم یہاں کہاں؟ کب آئیں؟ آؤ بیٹھو۔ یہاں بیٹھو“

”محمود کچھ کاغذات دراز میں بند کر رہا تھا۔ وہ ایک دم رک گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ نیلم

بھی بیٹھ گئی۔“

مگر تم نے خط تک نہیں لکھا کہ تم آرہی ہو۔ سچ مجھے تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے یقین کرو، کچھ دنوں سے تم بے حد یاد آرہی تھیں اور تمہیں خط لکھنے ہی والا تھا۔

”نیلم نے کہا“

”شادی کی خبر سنانا چاہتے تھے۔“

”محمود قہقہہ لگا کر ہنس پڑا“

”آخر عورت ہو، پاگل لڑکی! میں صرف تم سے شادی کروں گا“

”نیلم نے تڑپ کر پوچھا“

”تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟“

”محمود نے جلدی سے کہا“

”کہاں سب کچھ کیا ہے؟“

یہی جو شادی کی منظوری مل رہی ہے۔ بات چیت شروع ہونے والی ہے۔ تمہارا ایڈریس

مانگا جا رہا ہے۔ ادھر تو ساری تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔

”محمود نے پھر زور سے قہقہہ لگایا“

تم بھی ان کے ساتھ دیوانی ہو گئی ہو۔ لیکن یہاں سے چلنا چاہیے کسی دوسری جگہ بیٹھ کر

بات کرتے ہیں۔

”نیلم کا دل کسی حد تک خوش ہو گیا تھا۔“

چنانچہ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور محمود کے ساتھ باہر نکل آئی محمود نے دروازہ بند کر کے چابی جیب میں ڈالی اور نیچے اترنے لگا۔

”ارے تم اچانک آ گئیں؟ کب آئیں“

”رات آئی تھی“

”مگر اتنی جلدی کیسے؟“

”مجھے زگس کا خط ملا تھا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“

”بس! اتنی سی بات تھی“

”تم سمجھتے ہو یہ چھوٹی سی بات ہے؟“

”چھوٹی سے بھی چھوٹی بات ہے۔“

”مگر میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔“

”تم غلط فہمی میں ہو“

”اب وہ باہر بازار میں آ گئے تھے۔“

محمود نے پرلی طرف سے گاڑی نکالی۔ وہ دونوں اس میں سوار ہو گئے اور کار مال روڈ پر

شینان کی طرف چل پڑی۔

”محمود نے چائے کی پیالی بنا کر نیلم کے آگے کر دی۔“

”نیلم نے چمچ ہلاتے ہوئے کہا“

”میں ان لوگوں کو اپنے گھر کا ایڈریس ہی نہیں دوں گا“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

میں نے زگس سے کہہ دیا ہے کہ میرے والد صاحب دلی گئے ہوئے ہیں۔ بس وہ اس وقت تک وہاں سے واپس نہ آئیں گے جب تک کہ ہم دونوں کی شادی نہیں ہو جاتی۔“
 نیلم خاموش ہو گئی۔ پھر بولی

محمود! کہیں زگس کی طرح مجھے بھی دھوکا تو نہ دو گے؟

محمود ہنس پڑا اور اس نے نیلم کا ہاتھ تھام لیا

نادان نہ بنو نیلم! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ بھلا تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

لیکن محبت تو تم زگس سے بھی کرتے تھے۔ پیار تمہیں اس سے بھی تھا۔

محمود نے کہا

میں نے زگس سے کبھی محبت نہیں کی وہ بڑی اولڈ قسم کی لڑکی ہے۔ وہ مجھے کسی قسم کی بھی خوشی نہیں دے سکی۔

لیکن تم نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ اسی طرح جس طرح آج تم مجھے اپنی محبت کا یقین دلارہے ہو۔

ہاں! میں نے اس سے محبت کی تھی۔ صرف اس وقت تک جب کہ میں اسے ملا نہیں تھا، مگر جب اس سے ملا تو مجھے بہت حد معلوم ہو گیا کہ وہ کسی دوسری قسم کی لڑکی ہے۔

”لیکن تم نے شادی کی بات ہی کیوں شروع کی؟“
 ”محمود نے کہا“

”میں نے بات کب شروع کی تھی؟ بات تو اس طرف سے شروع ہوئی۔ ہوا یہ کہ ہم دونوں کو زگس کے والد کے ایک دوست نے اس ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ بزرگ ہمیں ایٹ آباد میں بھی دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے زگس کے والد کو سب حالات سے باخبر کر دیا۔“

”پھر“

پھر یہ کہ زگس کے والد نے روشن خیالی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے ہم دونوں کی شادی کی منظوری دے دی۔ بس اتنی سی بات ہے جسے لوگوں نے افسانہ بنا دیا ہے۔

”مگر اب تمہارا کیا رویہ ہوگا؟“

”میرا رویہ؟“

”محمود نے سگریٹ الیش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا“

”میرا رویہ صاف ظاہر ہے“

”کیا؟“

”یہی کہ میں شادی نہیں کروں گا۔“

”لیکن زگس سے کیا کہو گے؟“

”کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس صاف صاف کہہ دوں گا کہ میرے ماں باپ یہاں راضی

نہیں ہیں۔“

اور میں؟ نیلم نے پوچھا

تم بڑی پیاری لڑکی ہو نیلم! تم خوبصورت ہو۔ صحت مند ہو اور سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ تم سمجھدار ہو۔ مجھے سمجھتی ہو۔ میری خوشیوں کو سمجھتی ہو میں تم سے شادی کر سکتا ہوں اور ضرور کروں گا مگر پتھر کے بت سے شادی نہیں کروں گا۔

نیلم کے دل و دماغ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے خیال نہ تھا کہ محمود لاہور جا کر اس سے اس قسم کی گرمجوشی اور پیار و محبت کا اظہار کرے گا۔ اسے ان باتوں کی توقع نہ تھی۔ اس کا غم اور ناامیدی کا احساس خوشی اور مسرت میں تبدیل ہو گیا۔ مگر محمود! خدا کے لیے مجھے اپنے دل سے بھلا نہ دینا۔ نہیں تو میں مرجاؤں گی۔ میں پھر کہیں کی نہ رہوں گی۔

محمود نے میز کے نیچے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

محمود ہمیشہ سے تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا رہے گا، نیلم تم بے فکر رہو۔ آؤ اب چلیں۔ اور کل کہاں ملو گی؟

جہاں تم کہو گے؟ نیلم نے اپنے آپ ہی کہا
میرا خیال ہے کل پلازا میں پکچر دیکھی جائے
جیسی تمہاری مرضی

تو پھر کل پانچ بجے شیزان میں آ جانا۔
میں آ جاؤں گی۔

دوسرے دن نیلم نے سر درد کا بہانہ کیا اور نرگس کی خواہش کے باوجود وہ اس کے ساتھ کالج نہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کالج میں دیر ہو جائے گی۔ اور وہ شام کے لیے تیار نہ ہو سکے گی آج شام اسے محمود کے ساتھ سینما دیکھنے جانا تھا۔

وہ خوشی سے پھولی نہ سار ہی تھی۔

اسے اپنے تمام خواب پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ نرگس کو اکیلے ہی کالج جانا پڑا۔ وہ بھی اپنے طور پر بڑی خوش خوش تھی۔ وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کب محمود کا والد دلی سے واپس آئے اور ان کی طرف سے محمود کے گھر شادی کا پیغام بھیجا جائے۔ تیسرے پہر سے کچھ دیر پہلے جب وہ ایک خالی پیریڈ میں کالج میں لان میں آئی تو اس نے محمود کو ایک درخت کے نیچے ٹپکتے ہوئے دیکھا وہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس گئی۔

محمود نے نرگس سے کہا

”نرگس! میرے ساتھ ذرا باہر تک چلو۔“

نرگ ڈرسی گئی۔

”خیریت تو ہے نا۔“

محمود ہنس پڑا

فکر کی کوئی بات نہیں۔ تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

تو پھر میں چھٹی لے کر ابھی آتی ہوں تم باہر میرا انتظار کرو۔

ہموار کردوں گا پھر جب واپس آ کر یہاں شادی کا سلسلہ شروع ہوگا تو بات آسان ہو جائے گی۔

نرگس نے اداس ہو کر کہا

مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے محمود؟ تم نہ جاؤ۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔

محمود نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا

تم بالکل بچی ہو نرگس۔ بھلا اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟ کل چلا جاؤں گا اور

پانچ روز کے بعد آ جاؤں گا اور پھر والد صاحب سے بات بھی ہو جائے گی۔

نرگس نے غمگین لہجے میں کہا

مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے

نرگس؟ مجھے بھی تو بتاؤ

کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے محمود! ایسی بات جو میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ

دے گی۔

محمود ہنسنے لگا۔

ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ اب تو ہر بات اچھی ہو گئی۔ بچی اب تو ہماری شادی ہونے

والی ہے۔ تم دلہن بن کر آؤ گی۔ تمہارے ہاتھ ہندی سے رنگے ہوں گے۔ تمہارے سرخ کپڑوں پر

گوڑہ لگا ہوگا۔ تم پھولوں کی طرح حسین ہوگی اور میں دولہا بن کر تمہیں لینے آؤں گا۔“

نرگس نہر کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ٹھیک ہے محمود! مگر یہ سب باتیں ایسے لگ رہی ہیں جیسے خواب میں ہو رہی ہوں۔ خواب

بہت اچھا مگر دیر نہ کرنا۔

میں ابھی آتی ہوں۔

محمود دروازے کے باہر درختوں کے پاس اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اب وہ بالکل مطمئن سا تھا اور پریشانی کے تمام آثار اس کے چہرے پر سے مائب ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد نرگس گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ محمود نے باہر نکل کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ دونوں اس میں سوار ہو کر شہر سے باہر نہر کے کنارے آ گئے۔

یہاں انھوں نے ایک ویران جگہ پر کار روک لی اور باہر نکل کر نہر کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔

کیا بات ہے محمود؟ نرگس نے جلدی سے پوچھا۔

محمود نے سگریٹ نہر میں پھینکتے ہوئے کہا

بات یہ ہے نرگس کے والد صاحب نے مجھے دلی بلایا ہے۔

نرگس ایک دم سہم گئی۔

”مگر کیوں؟“

”کاروباری سلسلے میں کوئی کام پڑ گیا ہے۔“

”پھر کب آؤ گے؟“

بس ایک آدھ ہفتے کے اندر اندر۔ والد صاحب کے ساتھ ہی آ جاؤں گا اور یہ موقعہ بھی

اچھا ہے نرگس میں راستے ہی میں ان سے شادی کی ساری بات کر دوں گا۔ میں زمین کو پوری طرح

میں نظر آ رہی ہوں اور خواب کبھی پورے نہیں ہوا کرتے۔

محمود نے اسے تسلی دینی شروع کی۔

گھبراتی کیوں ہو زگس! میں تھوڑے ہی دنوں کے لیے تو جا رہا ہوں اور کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا؟ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟

زگس نے محمود کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔

محبت میں تمہاری پوجا کرتی ہوں محمود! میں تم پر اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔ میری محبت سمندر میں جے ہوئے پتھر کی طرح ہے جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہل سکتا۔

میں بھی تمہیں اس اعتماد اور اسی قوت کے ساتھ محبت کرتا ہوں زگس! مجھ پر بھروسہ رکھو۔

تم پر بھروسہ ہی ہے تو جی رہی ہوں محمود۔ جس روز یہ بھروسہ یہ اعتماد اڑ گیا اسی دن میں بھی مرجاؤں گی۔ میری زندگی تیرے پیار اور تیرے اعتماد سے حرارت اور خوراک حاصل کر رہی ہے۔

جس طرح سورج مکھی کا پھول سورج سے اور مچھلی پانی سے وابستہ ہے اسی طرح میری زندگی بھی تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو چکی ہے۔

محمود گہری سوچ میں اتر گیا تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ زگس کی باتوں نے ایک پل کے لیے اس کے دل میں اس احساس شرافت کو بیدار کر دیا ہے جو فطرت نے ہر ذی روح کے اندر ڈال رکھا ہے۔ لیکن جسے ہم لوگوں نے غلط ماحول، غلط تعلیم اور غلط خیالات کی وجہ سے ختم کر دیا ہے۔

ایک گھڑی کے لیے وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

کیا کرنے والا ہے؟

لیکن فوراً ہی اس نے ان خیالات سے اپنا دامن چھڑا لیا اور زگس کی طرف مخاطب ہو

کر بولا

میری زندگی بھی تم سے ہی وابستہ ہے زگس میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تم جھوٹ کہتے ہو۔ مرد ہر طرح زندہ رہ سکتے ہیں وہ عام طور پر زندہ رہتے ہیں وہ زندہ رہنا جانتے ہیں۔ وہ ہر ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ اگر زندہ نہیں رہ سکتی تو صرف میں ہی زندہ نہیں رہ سکتی۔

محمود نے کہا

ایسی باتیں نہ کہو زگس۔ وقت آنے پر ہر چیز کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ میں یہ باتیں نہیں کہتا کہ تم میرے بغیر زندہ رہ سکتی ہو یا یہ کہ تمہیں مجھ سے پیار نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ کہتا چاہتا ہوں کہ میری بھی ایسی ہی حالت ہے جب سے تمہیں دیکھا ہے میرا دل تمہارے قدموں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نچھاور ہو چکا ہے۔ یقین کرو میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔

زگس رونے لگی اور اس نے اپنا سر محمود کے سینے پر رکھ دیا۔ محمود نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اسے آہستہ سے سر پر پیار کیا اور کہا

ہمت نہ ہارو۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا تم بڑے آرام اور سکون سے رہنا۔

زگس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

میرا آرام اور سکون تو تم ساتھ ہی لیے جا رہے ہو۔

محمود نے فوراً کہا

وہ میں تمہیں ابھی واپس کر دیتا ہوں۔

اس پردوں ہنس پڑے

آؤ اب چلیں

دونوں کار میں سوار ہو گئے۔ محمود نے نرگس کو کالج کے گیٹ سے ذرا ادھر ہی اتار دیا اور خود اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے سیدھا ہوٹل پہنچا۔ اس وقت پونے تین بج رہے تھے۔

پانچ بجے شام نیلم محمود کا انتظار کر رہی تھی۔

شیراز میں بیٹھ کر ان دونوں نے چائے پی، چاء کے دوران میں محمود نے اُسے بتایا کہ وہ نرگس کو دلی جانے کا کہہ آیا ہے۔ نیلم نے کہا :
نرگس نے مجھ سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ بڑی اُداس اُداس تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ہی اس کی زندگی کو ختم کر رہی ہوں۔ جیسے میں اس درخت کی جڑیں کاٹ رہی ہوں جس پر نرگس نے بڑی محنت سے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔

محمود ہنسنے لگا۔

شاعری کی باتیں نہ کرو نیلم! زندگی بسر کرنے کے لیے شاعری کی نہیں بلکہ قاہری کی ضرورت ہے۔

نیلم کانپ گئی۔ کچھ بھی ہو نرگس اس کی پیاری سہیلی تھی۔ محمود جب تک ان کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں بڑے سکون کے ساتھ اور بڑے پیار اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کر

رہی تھیں۔ لیکن اس ایک شخص کی آمد سے ان کی زندگی کا سارا نظام، سارا توازن درہم برہم ہو گیا تھا۔ اب دوستی کی بجائے رقابت اور دشمنی نے جنم لے لیا تھا۔ اس بات کا نیلم کو کبھی کبھی بڑا گہرا احساس ہوا کرتا تھا۔

یہ کاٹا بڑا اس کے ضمیر میں کھٹک رہا تھا۔ مگر دوسری طرف محبت کی طاقت بھی بڑی شدید تھی۔ وہ ایک سیلاب تھا، طوفان تھا جس کی زد میں آنے والا ہر گھر وندا، ہر درخت تنکوں کی طرح بہتا چلا جا رہا تھا۔ اب محمود کی زبان سے یہ سن کر کہ زندگی بسر کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرنی ہی پڑتی ہیں۔ اسے ایک قسم کا اطمینان سا ہوا۔

مگر محمود! کیا زندگی بسر کرنے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے؟

کیا اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں؟

”نہیں نیلم! ہمیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے بعض ایسی باتیں بھی کرنی پڑتی ہیں جو دوسروں کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں، انسان کی ترقی کی شاہراہ دریا کی طرح مسلسل رواں ہے۔ اس کی لہر کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتی یہاں پر بہار کے بعد خزاں اور ہر خزاں کے بعد بہار کا ظہور ہوتا ہے۔“

نیلم خاموش ہو گئی اور سوچنے لگی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

”ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہیے“

”مگر کیوں؟“

محمود زور سے ہنس پڑا

یہ میں نہیں جانتا میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میں زندگی کو خوبصورت، صحت مند اور اپنی مرضی

کے مطابق بسر کرنا چاہتا ہوں۔ باقی جو کچھ بھی ہے میں اس پر کبھی زیادہ غور نہیں کرتا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں اور تمہیں حاصل کرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ اس لیے کہ تم سے مل کر میں بہتر طریق سے زندگی بسر کر سکوں گا۔ اگر تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے دو ایک دوستوں کو چھوڑ بھی دینا پڑے تو اس میں ہرج کی کوئی بات ہے۔ ان لوگوں کو اور دوست مل جائیں گے مگر مجھے نیلم نہیں ملے گی۔

نیلم کا دل خوشی سے مسکرانے لگا۔

کیا تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو محمود! سچ بتانا کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے؟

محمود نے نیلم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا

جس روز تمہیں دھوکا دوں گا جانتی ہو اس روز کیا ہوگا؟

کیا ہوگا؟ نیلم نے بے تابی سے پوچھا

اس روز زندگی بھی مجھے دھوکا دے جائے گی۔

”سچ“ نیلم کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔

بالکل سچ اور اب چلو سینما چلیں وقت ہو رہا ہے محمود نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا

سینما کے بکس میں داخل ہونے کے بعد محمود نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پردہ آگے

سرکالیا نیلم نے کہا

یہ باکس خوبصورت ہیں۔

محمود نے اس پر جھکتے ہوئے کہا

اور پر اسرار بھی

نیلم مسکرانے لگی

محمود نے سگریٹ سلگا لیا اور نیلم کے پاس ہی سرخ پلش کے نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ نیلم

نے کہا

لیکن محمود میری شادی کا کیا ہوگا؟

محمود ذرا بے چین ہو گیا۔ اصل میں وہ ایسے روحانی ماحول میں اس قسم کی باتیں نہ سننا

چاہتا تھا۔ مگر یہاں مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ نہ صرف وہ اس قسم کی باتیں سنے بلکہ ان کا جواب بھی

دے۔

”اس نے کہا“

”وہی ہوگا جو منظر رخصتا ہوگا۔“

نیلم ہنسنے لگی

اور خدا کو کیا منظور ہے؟

وہی جو ہم دونوں چاہتے ہیں

نیلم نے کہا

میں تو تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

محمود نے کہا

اور میں بھی چاہتا ہوں۔ زندگی کے صحرا میں صرف میں ایک ایسا شاداب درخت ہوں

جس کی چھاؤں میں میرے لیے ہر قسم کی راحت موجود ہے۔

نیلم بولی

اب شاعری کرنے لگے ہو

محمود ہنس پڑا۔ اتنے میں ہال کی بتیاں گل ہو گئیں اور فلم شروع ہو گئی۔ محمود نے اپنا ایک ہاتھ نیلم کی کمر کے گرد ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔
بس میں چاہتا ہوں کہ ساری زندگی اسی طرح گزر جائے۔ ہم دونوں سرخ ریشمی صوفوں پر بیٹھے ہوں۔ میرا ہاتھ تمہاری کمر کے گرد ہو دوسرا تمہارے ہاتھ میں اور ہم دونوں پیار و محبت کی باتیں کیئے جارہے ہوں اور فلم کبھی ختم نہ ہو وقت کبھی ختم نہ ہو۔

نیلم نے کہا

مگر محمود ایسا نہیں ہوتا

کاش ایسا ہو سکتا!

ہاں! کاش کبھی کہیں ایسا ہو سکتا۔ مگر اس کرہ ارض پر کسی جگہ بھی یہ خواب پورا نہیں ہو سکتا۔
یہاں محبت کرنے والوں کے لیے جدائی یا شادی ضروری ہے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں

کوئی راستہ نہیں

محمود نے کہا

تیسرا راستہ ہے

کونسا راستہ؟

موت کا راستہ

نیلم ایک دم ڈر گئی۔

ایسی باتیں نہ کرو محمود۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی میں ابھی بہت دیر تک زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے میں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے

تم نے کچھ نہیں دیکھا؟

کچھ بھی نہیں

تو پھر تمہاری نظر کمزور ہے نیلم

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔ محمود نے نیلم کی کمر کے گرد اپنے بازو کی گرفت زیادہ مضبوط کر لی

میرا دم گھٹ رہا ہے محمود

محمود اس پر جھک گیا اور اس نے نیلم کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے ہونٹ نیلم کے ہونٹ پر

رکھ دیئے نیلم نے محمود کو اپنے دونوں ہاتھوں سے آہستہ سے پیچھے ہٹا دیا۔

کوئی اندر آ جائے گا

دروازہ بند ہے

لیکن یہ سینما ہال ہے۔ ہماری آواز کوئی سن لے گا۔

یہاں کوئی آواز نہ آئے گی۔ ہم خاموش فلموں والا پیار کریں گے۔ ہماری حرکتیں ہی ہوں

گی۔ آواز کہیں نہیں ہوگی۔

نیلم ہنسنے لگی اور اندھیرے میں اس کے دانت چمکنے لگے۔

تم کسی وقت بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو محمود

ڈھلتا سورج

نرگس کے لیے محمود لاہور سے باہر گیا ہوا تھا۔

مگر نیلم سے اس کی تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی۔ یہ ملاقات عام طور پر شیزان سے شروع ہو کر پلازا سینما کے نیم روشن باکس میں پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ نیلم محبت کے اس نشے میں اس قدر چور ہو گئی تھی کہ اسے ارد گرد کی فضا کا بالکل ہوش نہ تھا۔ حالات کی رفتار کیا تھی اور واقعات سے کیا صورت اختیار کرنے والے تھے اس کے متعلق اس نے کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

اس کے نزدیک زندگی کے شب روز اس طرح گزر رہے تھے جس طرح کوئی کشتی میں بیٹھا دریا کی پرسکون لہروں پر بہتا چلا جا رہا ہو اور ان لہروں کے اندر جو طوفان چھپا بیٹھا ہو اس کی اسے مطلق خبر نہ ہو۔

شاید اُسے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ وہ واقعات کو حقائق کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکے۔ محبت میں وہ بالکل اندھی ہو چکی تھی اور اس اندھے پن میں اس نے اپنی عزیز سہیلی سے بھی فریب کھینے میں شرم محسوس نہ کی تھی۔ کوئی کاٹا اس کے ضمیر میں نہ کھکا تھا۔ کسی آواز نے اسے ملامت نہ کی تھی یا شاید ایسا ہوا ہو لیکن وہ اس قدر بے حس ہو چکی تھی کہ اس نے محسوس تک نہ کیا۔

اُسے یہ بھی خیال نہ آتا کہ وہ شخص جس نے ایک لڑکی سے اظہار محبت کے بعد اسے پاؤں

تم بھی بہت دلچسپ ہو

اس کے بعد محمود ایک بار پھر نیلم پر جھک گیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ کر پیار کرنے لگا۔ نیلم نے ذرا سا احتجاج کیا پھر وہ بھی بے بس سی ہو گئی اور پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہر آواز گم ہو گئی۔ ہر تصویر غائب ہو گئی وقت رک گیا۔ کائنات کی گردش جیسے تھم گئی اور جب نیلم کی آنکھ کھلی تو انٹرول ہو چکا تھا۔

ذرا ٹھہرو میں کچھ کھانے کو لے آؤں

محمود باہر نکل گیا

تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں پھلوں سے بھرا ہوا لفافہ تھا۔ نیلم نے

اس دوران میں چہرے کا میک اپ پھر سے درست کر لیا تھا۔ محمود نے اندر داخل ہو کر کہا

تمہارے ہونٹ ان اتاروں سے زیادہ سرخ ہیں نیلم اور تمہاری باتوں میں ان اتاروں سے زیادہ مٹھاس ہے۔ میں ان کی تشبیہ کس سے دوں؟

نیلم شرمناک مسکراتے لگی

اس کے ہونٹوں پر حجاب تھا، جو بے نقاب ہو چکا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

سے ٹھکرا دیا ہے وہ اسے بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ اگر اسے یہ خیال آتا بھی تو وہ اسے ٹال دیتی اور دل کو اس طرح تسلیاں دیتی۔

نہیں محمود مجھ سے دھوکا نہیں کر سکتا۔

وہ مجھے چاہتا ہے، صرف مجھے چاہتا ہے

دوسری طرف زگس بھولی بھالی معصوم زگس کو ان باتوں کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ دعا و فریب کی ان خاردار جھاڑیوں سے دور سہانے جنگل میں پرسکون چشمے کے کنارے بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی جس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد واپس آ جائے گا۔

اس کے معصوم اور پاکیزہ دل میں شک و شبہ کا گزرتا نہ تھا۔ وہ کنول کے پھول کی طرح بے داغ عقیدت کے ساتھ اپنی محبت کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھی، اور نیلم اور محمود محبت نہیں بلکہ حرص و ہوس کی دلدل میں دھنسنے قہقہے لگانے ویرانی اور تباہیوں کے شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ انہیں تن بدن، عزت و ناموس کا ہوش تک نہ تھا۔

انہوں نے زندگی کی ہر خوبصورتی کو پاؤں تلے مسل دیا تھا

ایک روز نیلم نے شیراز میں بیٹھے ہوئے محمود کو بتایا

آج زگس تمہیں بہت یاد کر رہی تھی

محمود نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا

اچھا! کیا میں بہت یاد آ رہا تھا؟

نیلم ہنس پڑی

وہ تو بے چاری رو رہی تھی

محمود قہقہہ لگا کر ہنس پڑا

عورت کا سب سے کامیاب ہتھیار رونا ہے۔ اس ہتھیار کے استعمال سے اس نے فرہاد

سے لے کر نپولین تک، ہر مرد کو بے وقوف بنایا ہے۔

نیلم نے کہا

لیکن محمود! تمہیں زگس کے آنسوؤں کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ میں دوسری ہر عورت کے متعلق اس الزام کو کسی نہ کسی حد تک قبول کرنے کو تیار ہوں۔ مگر زگس کے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔

تم دیوانی ہو

کچھ بھی ہو میں اس کے جذبہ دل کے خلوص اور صداقت کی قدر کرتی ہوں۔ وہ لاکھ میری رقیب سہی مگر میں یہ تمہیں صاف صاف کہوں گی کہ محبت میں جس مقام کو اس نے حاصل کیا ہے۔ جس منزل تک اس نے رسائی حاصل کی ہے ہم لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

محمود ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا

نادلوں میں لکھی ہوئی باتوں کا مذاق نہ اڑاؤ۔ عورت اگر وہ سچ عورت ہے تو کبھی اور کسی

سے وفا نہیں کر سکتی۔

نیلم نے کہا

تم بھول رہے ہو کہ میں بھی ایک عورت ہوں اور تم سے وفا کا اقرار نہ کر سکتی ہوں۔

محمود نے فوراً پیٹر ابدلا

تم بھی بھول رہی ہو کہ تم عورت نہیں بلکہ لڑکی ہو اور پھر محمود کی محبوبہ ہو۔ تم اگر محمود سے پیار نہ بھی کرو، جب بھی وہ تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہے گا۔

نیلیم ایک دم خوش ہو گئی۔

مگر خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ اس موضوع ہی کو بدل دو کوئی اور بات کرو۔“

محمود نے کہا

تم بے شک نرگس کی بات کرو۔ مجھے اس کے ذکر سے عداوت نہیں ہے بلکہ میں تم پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک بیوقوف لڑکی ہے جسے دنیا میں سوائے محبت کے اور کوئی کام نہیں ہے نیلیم نے کہا

تو کیا محبت کرنا حماقت ہے؟

محمود نے نیا سگریٹ سلا لیا۔

”صرف محبت کرنا حماقت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بے وقوفی کی بات ہے۔ افسوس تو یہی ہے کہ نرگس صرف محبت کرنا جانتی ہے۔ وہ تمہاری طرح محمود کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی، وہ مجھے زندگی کا حقیقی لطف اور مسرت عطا نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے تم میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔“

”ہاں! سمجھ گئی ہوں۔ نیلیم نے بے دلی سے کہا چائے بنانے لگی۔

نیلیم نے بعد نیلیم نے ایک گھونٹ پیا اور چھوٹے سے خوبصورت ریشمی رومال سے

اپنا منہ پونچھتی ہوئی بولی

مگر جو بات میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں اسے تو تم نے سنا ہی نہیں

محمود نے پوچھا

وہ کونسی بات تھی؟

وہ بات یہ تھی کہ رات نرگس کے والد اور والدہ کے درمیان نرگس کی شادی کے بارے میں کچھ باتیں ہوئی ہیں۔

پھر کیا ہوا

محمود نے غیر دلچسپی سے کہا۔ اس لیے کہ اب اسے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نیلیم کو محمود کا یہ انداز بے حد برا لگا۔ بہر حال نرگس اس کی سہیلی اور بہن تھی اور وہ اس کی بے حد عزت کرتی تھی اس نے کہا

محمود مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تمہیں اتنی جلدی نرگس سے اس قدر نفرت کیوں ہو گئی ہے۔ کل تک تم اس کی محبت میں سرشار تھے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہیں نرگس کے انتقال میں اس پہاڑی عداوت کے پل پر بے قراری کے عالم میں ٹہلتے دیکھا تھا اور آج یہ عالم ہے کہ تم اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کر رہے آخر اس میں راز کیا ہے؟ مجھے بھی کچھ بتاؤ۔“

راز کچھ نہیں نیلیم اور اگر تم اسے راز ہی سمجھنے پر مجبور ہو تو وہ یہ ہے کہ نرگس کا جسم بے مستی ہے۔ مجھے اس کے قریب جا کر ہمیشہ یوں لگا ہے جیسے میں چھیلی ہوئی ارویوں کے ڈھیر کے پاس آ گیا ہوں۔ وہ گورا ضرور ہے مگر اس کے گورے پن میں سنگ مرمر کی ٹھنڈک اور بے جسی ہے۔

اب میں کیا کروں

نیلیم کے دل میں اندر ہی اندر ایک سوال نے سراٹھایا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

اور میں میرا مطلب ہے میں کیسی ہوں

محمود نے سوچا آخر عورت ہے، نہیں رہ سکی۔ کتنی جلدی اس نے اپنی سہیلی کو بھلا دیا، اس

نے ذرا کھنکھارتے ہوئے کہا

ارے تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ! تم بڑی زندگی سے بھرپور لڑی ہو۔ تمہیں دیکھ کر محسوس ہوتا

ہے کہ چاند رات کو طلوع کیوں ہوتا ہے اور تم سے باتیں کرنے کے بعد اس کا علم ہوتا ہے کہ بہار کی صبح

کو ہوا پھولوں کو چھو کر کیوں گزرتی ہے؟

نیلیم کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک دم ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے

بالوں کو سہلاتا ہوا گزر گیا ہو اس نے شرم سے تھمتھایا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر کہا

رات نرگس کی والدہ کہہ رہی تھی کہ اب اس کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ چچا جان کہہ

رہے کہ لڑکے کا باپ یہاں نہیں وہ دہلی گیا ہوا ہے۔ جس وقت بھی واپس آیا اسی وقت بات شروع کر

دی جائے گی۔

محمود ہنس پڑا

بے وقوف کہیں کے! بھلا میں اور ان کی لڑکی سے شادی کروں؟ اس سے کہیں بہتر ہو

گا کہ پتھروں کے کسی ٹھنڈے غار میں جا کر عمر گزار دوں۔

نیلیم نے کہا

لیکن میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ اس لیے کہ جب تم اپنا

پتہ ہی نہ دو گے تو پھر وہاں شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محمود نے وقت دیکھا

میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ سینما کا وقت ہو رہا ہے۔ نیلیم نے شرم آلود مسکراہٹ سے

کہا

آج میری طبیعت خراب ہے کل چلیں گے

سینما دیکھنے کے بعد طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اس کا وعدہ لیتا ہوں

نیلیم ہنس پڑی اور دونوں شیزان سے باہر نکل آئے

دوسرے روز نیلیم کو خفیہ طور پر محمود کا ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ایک ضروری

کام کے سلسلے میں مجھے لاہور سے چند روز کے لیے باہر جانا پڑ گیا ہے تم فکر نہ کرنا میں جلدی ہی واپس

آ جاؤں گا اور واپس پہنچتے ہی تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ تم میرے دوسرے خط کا انتظار کرنا۔

نیلیم کا دل ایک دم اُداس ہو گیا

اس نے سوچا، ایسا اچانک کونسا کام پڑ سکتا ہے! اگر اسے جانا ہی تھا تو اس نے کل شام ہی

اس سے اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟ اب نیلیم کے دل کو طرح طرح کے دوسو سوں نے گھیر لیا۔

اب وہ بھی سوچنے لگی کہ کہیں محمود اس کے ساتھ دھوکا تو نہیں کر رہا؟ کہیں نرگس کی طرح

وہ اسے بھی تو ٹھنکرا کر نہیں چلا جائے گا؟ بہر حال اس کا دل بھگ سا گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ اب وہ واپس اپنے گھر راولپنڈی پہنچی جائے یا وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے۔

اس رات نیلم کھانے کے بعد نرگس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

نرگس اپنی کھڑکی میں باغ کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ چاندنی رات تھی باغ میں چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ سبزے پر درختوں کے سائے آرام کر رہے تھے اور کھلی کھڑکی میں سے گلاب اور رات کی رانی کی دھیمی دھیمی مہک اندر آرہی تھی۔

نرگس نے نیلم کے قدموں کی آہٹ کو بالکل نہ سنا۔ وہ اپنے خیالات میں حد درجہ محو تھی اور اس کو دنیا و مافیہا کا مطلقاً ہوش نہ تھا۔ نیلم کے دل میں نرگس کی یہ حالت دیکھ کر رحم کا بے پناہ جذبہ بیدار ہوا مگر وہ مجبور تھی۔ اب حالات کا دھارا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کی حالت بالکل اس ملاح کی سی تھی جس نے کشتی کو پار لگانے کے لیے بخور میں ڈال دیا ہو۔ اس کا خیال ہو کہ وہ ناؤ کو اپنے زور بازو سے کھینچ کر لے جائے گا لیکن گرداب کے چکروں نے کشتی کو اپنی لہروں میں گھومتی ہوئی غضبناک لہروں میں جکڑ لیا ہو اور اب وہ بے بسی کے عالم میں تہوار چھوڑے کشتی میں بیٹھا ساحل کو تک رہا ہو اس نے آہستہ سے نرگس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

نرگس نے چمک کر پیچھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نیلم کے دل پر چھری سی چل گئی۔ اس نے کہا

نرگس رو کیوں رہی ہو اتنی جلدی دل نہ ہارو۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔

نرگس نے بے بسی کے عالم میں نیلم کو دیکھا اور پھر ٹکا ہیں باغ کی طرف پھیر لیں۔

نیلمی میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اور اس کے بعد وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ نیلم نے اسے پٹنگ پر اپنے پاس بٹھلایا اور کھڑکی بند کر دی۔

پاگل نہ بنو نرگس! اگر تم نے اپنی یہ حالت بتائی تو پھر تمہاری کامیابی غیر یقینی ہے اور ابھی تو تمہارے گھر والوں کو اس کا علم ہے پھر یہ بات تمام رشتہ داروں میں عام ہو جائے گی اور تم خواہ مخواہ بدنام کر دی جاؤ گی۔

نرگس نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

تو پھر میں کیا کروں نیلمی؟ مگر خدا کے لیے اپنی محبت کو اس طرح عام نہ کرو۔

نرگس نے اپنے آنسو خشک کر لیے اور پٹنگ پر اونچی ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے گرم شال اوڑھ لی۔

لیکن نیلمی وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ اس نے کہا تھا کہ میں ایک ہفتے کے اندر اندر

پہنچ جاؤں گا اور آج دسواں دن گزر رہا ہے اس نے وہاں جا کر ایک بھی خط نہیں لکھا۔ اگر اسے دیر ہی کرنا تھی تو کم از کم مجھے ایک آدھ خط ہی لکھ دیتا۔ اب تم ہی بتاؤ اگر اس نے ایسی ویسی بات کر دی تو گھر میں میری کس قدر بے عزتی ہوگی۔ ابا جان صرف میری خاطر اس بات پر راضی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے محمود کو دیکھا تک نہیں اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اب اگر اس نے لا پرواہی سے کام لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ میرے لیے تو بس یہی ہوگا کہ کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں

”نیلم نے کہا“

”تم فکر نہ کرو۔ وہ آجائے گا کہیں ضروری کام پڑ گیا ہوگا اور پھر اس کی طبیعت بھی تو ذرا

نیلیم نے کہا

میں چائے بناتی ہوں

اس کے بعد وہ جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی اور سماوار اٹھالائی۔ سماوار کو اس نے کھڑکی کھول کر اس کی سل پر باہر کی جانب رکھ دیا اور اس میں کاغذ جلا کر بجھے ہوئے کونکوں کو سرخ کرنے لگی

آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے چاء بنا کر دوں گی۔

نرگس کے چہرے پر مسرت کا نور سا پھیل گیا۔ اس نے نیلیم سے بڑی محبت تھی اور اس پر اسے کامل اعتماد بھی تھا۔ تھوڑا عرصہ پہلے وہ کھڑکی میں بے حد اس ہو کر کھڑکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب زندگی کس طرح گزرے گی۔ مگر اب اس کا جی بہل گیا تھا اور اسے زندگی کی تاریکی میں کہیں کہیں روشنی کے شعلے سے اٹھتے نظر آنے لگے تھے۔

نیلیم نے آگ دہکالی تھی۔ اور اس نے سماوار میز پر رکھ دیا تھا۔ سماوار میں پانی گرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سبز چائے کی پیتیاں اس میں ڈال دیں اور میز پر سبز بیلوں والی دو پیالیاں سجا دیں۔ نرگس نے کہا

مجھے ناںہال کی وہ رات یاد آگئی ہے جب ہم لوگ خالہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور رات کو خالہ کی بڑی لڑکی سون نے ہمیں چاء بنا کر پلائی تھی تمہیں یاد ہے نا نیلی؟ وہ رات کتنی خوشگوار اور پرسرار تھی ایسے لگتا تھا جیسے سارے کشمیر کی وادی پر ایک خواب انگیز دھند سی چھا گئی ہے، جیسے سارا کشمیر ایک خواب دیکھ رہا ہے اور ہم اس خواب کے چلتے پھرتے کردار ہیں، تمہیں یاد ہے نا؟

لا ابالی سی ہے۔ ورنہ ایک آدھ خط ہی لکھ دیتا۔ بہر حال تم ہمت نہ ہارو۔ وگرنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور پھر ساری عمر اس وقت کو بیٹھ کر یاد کیا کرو گی اور روتی رہا کرو گی۔ نرگس کو ذرا حوصلہ سا ہوا۔“

خدا کرے کہ اسے کام ہی پڑ گیا ہو۔ خدا کرے کہ وہ خیریت سے ہو۔ مگر اسے ایک خط ضرور لکھ دینا چاہیے تھا۔ کیا اسے بالکل احساس نہ ہوا کہ نرگس وہاں کیا کر رہی ہو گی! وہ کتنی بے چین ہو گی۔ وہ آتو لے۔ اچھی طرح اس سے پوچھوں گی

”نیلیم کا جی بھر آیا“

نرگس کی محبت کس قدر بھولی اور معصوم تھی۔ بچی جس شخص کی محبت میں وہ اتنی بلندی پر اڑ رہی ہے اس نے بجھے ہوئے سگریٹ کی طرح اسے اپنی زندگی سے نکال کر رکھ دیا اور شروع ہے۔ اس کا ایک پل کے لیے جی چاہا کہ وہ نرگس کے سامنے پوری حقیقت بیان کر دے اور شروع سے آخر تک اسے پوری حکایت بیان کر دے اور پھر اس کے پاؤں پر گر کر اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے، لیکن پھر دل نے اس کا دامن پکڑ لیا اور وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ سچ نہ بول سکی۔ شاید اس دنیا میں ایک آدمی کو قتل کرنے کے لیے اتنی ہمت کی ضرورت نہیں جتنی سچی بات کہنے کے لیے ہے کاش! وہ اس وقت جھوٹ کا چہرہ نوچ لیتی۔

لیکن نیلیم خاموش رہی اور سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ ہماری ہی نہیں بلکہ اس سارے دور کی یہی ٹریجڈی ہے کہ ہم لوگ سوچتے زیادہ ہیں اور عمل کم کرتے ہیں۔ بولتے زیادہ ہیں اور سنتے کم ہیں۔

نرگس نے کہا

سردی زیادہ ہو گئی ہے۔

سمادار میں سے چاء کے ابلنے کی آواز ہلکی ہلکی سسکار بلند ہونے لگی تھی۔ نیلم ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول سی گئی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات کی وادی میں خواب کا سفر کر رہی ہے۔

نرگس کی آواز پر اس نے چونک کر کہا

ہاں نرگس! مجھے یاد ہے وہ رات اچھی طرح یاد ہے وہ زندگی بڑی اچھی تھی نرگس!

بے فکری اور بھولپن کی زندگی، تب ہمارے دل مکرو فریب کی دنیا سے آشنا نہیں ہوئے تھے اس وقت ہمارے دل پھول کی طرح معصوم اور بے داغ تھے۔ ان میں گھٹیا قسم کی خواہشات کا ہجوم نہیں تھا۔ تب ہم سکھ کی نیند سوتی تھیں اور رات کو پریوں کے خواب دیکھا کرتی تھیں اور اب؟

نرگس نے کہا

اب وہ بات کہیں بھی نہیں نیلی! اب تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے دھکا دیکر خاردار جھاڑیوں میں پھینک دیا ہے۔ جگہ جگہ سے دامن الجھ رہا ہے۔ رہائی کا کوئی راستہ نہیں۔“

نیلم نے پیالیوں میں سبز چاء انڈیل دی۔ دونوں سہیلیاں خاموشی سے رات کی چاندنی سے منور پرسکون لمحات میں چاء پینے لگیں۔ دونوں کے دل میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کا دل محبت کی روشنی میں سنار ہا تھا اور دوسری کے دل میں محبت کے تاریک سائے تھے۔ اچانک باغ میں سے کسی پرندے کے بولنے کی آواز آئی۔ نرگس نے کہا

شاید اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہے

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا

اس کی آنکھوں میں جیسے آنسو تھے۔

☆☆☆☆☆

افشائے راز

دوسرے روز نرگس کو کالج سے چھٹی تھی۔

چنانچہ وہ دیر تک بستر میں لیٹی رہی۔ بستر میں لیٹے ہی لیٹے اس نے صبح کی چائے پی اور اخبار کا مطالعہ کیا۔ آج موسم بھی ابر آلود تھا اور سردی تھی۔ آسمان کو بھورے رنگ کے بادلوں نے گھیر رکھا تھا اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ نیلم اپنے بھائی کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ جب کافی دن چڑھ آیا تو نرگس آہستہ سے لحاف ایک طرف کر کے بستر سے باہر نکلی۔ ایک ہلکی سی انگڑائی لی۔ سیلپر پہنے اور گلدان میں سجے ہوئے گلاب کے تروتازہ خوشبودار پھولوں کو پیار کرنے لگی۔ کتنے خوبصورت تھے یہ پھول! اس نے سوچا ان کی تروتازگی اور حسن اور معصومیت میں ہیٹکلی کارنگ تھا۔ اتنے میں ملازمہ نے اندر آ کر بتایا کہ نہانے کے لیے پانی گرم ہے۔

نرگس نے تولیہ کندھے پر ڈالا اور گنگنائی ہوئی غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ آج اس کا دل ایک نامعلوم خوشی کے احساس سے سرور اور ہلکا پھلکا تھا۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ شاید موسم کے خوشگوار ہونے کا اثر تھا یا شاید اس غم کا رد عمل تھا جو کئی روز سے تاریک دھند بن کر اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

غسل کرنے کے بعد وہ اپنے لمبے سنہری بالوں کو جھٹکتی ہوئی غسل خانے کے باہر نکلی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ان میں آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگی نہانے کے بعد اس کا گوار رنگ نکھر کر کندن کی طرح ہو رہا تھا اور نیلی آنکھوں پر ان خوابگوں جھیلوں کا گمان ہو رہا تھا۔ جس پر سورج کی

شعاعیں چمک رہی ہوں۔

بناؤ سنگھار سے فارغ ہو کر اس نے سفید اُجلے اور پاکیزہ کپڑے پہنے بالوں میں ایک طرف کر کے گلاب کا نسبتی پھول سجایا اور میز پر چاء پینے بیٹھ گئی۔ اس نے خادمہ سے کہلوا کر خاص طور پر آج سبز کشمیری چائے بنوائی تھی۔ جیسے وہ نہانے کے بعد گلاب کے پھول سجا کر پینا چاہتی تھی۔ چائے سے فارغ ہو کر وہ کھڑکی میں آکھڑی ہو گئی۔ باہر کا موسم انتہائی دل آویز تھا۔ آسمان پر بھورے رنگ کے بادلوں کے ٹکڑوں آوارہ کشتیوں کی طرح اپنے گدے لے بادیان پھیلائے اڑے جارہے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی اور تروتازہ ہوا میں پھولوں کی نازک ٹہنیاں بے خیالی میں جھوم رہی تھیں۔

گنجان آم کے درختوں میں خوش الحان طائر اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ فضا میں پھولوں کی ملی جلی مہک بس رہی تھی اور مشام جان کو نئی زندگی عطا کر رہی تھی۔

کھڑکی میں اس طرح کھڑے اور فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے نرگس کو بمشکل چند لمحے ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک ساتھ والی کوٹھی کی دیوار کے اس طرف کھڑکی کا پٹ کھلا اور اسی بد صورت لڑکے کا سر نمودار ہوا۔ نرگس کو اس وقت اس لڑکے کی مداخلت بڑی بڑی محسوس ہوئی لیکن اس خیال سے کہ وہ اسے اتنی اہمیت ہی کیوں دے نرگس وہاں سے بالکل نہ ہلی اور اسی طرح کھڑی رہی۔

وہ لڑکا پہلے تو چپ چاپ بت بنا کھڑا رہا اور بڑی دیران اور اداس نگاہوں سے نرگس کو تکتا رہا۔ پھر ایک دم اس نے ہاتھ کے اشارے سے نرگس کو اسی جگہ ٹھہرنے کو کہا اور خود غائب ہو گیا۔ نرگس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے؟ وہیں کھڑی رہے یا واپس چلی جائے۔ بہر حال وہ لڑکا اس جگہ

اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں نرگس کے دل میں ایک طرح کا تجسس بھی پیدا ہوا کہ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ذرا دیکھا تو جائے کہ وہ آج اتنی دیر بعد کیا کہنا چاہتا ہے؟

یہ لڑکا ایک عرصے سے خاموش تھا اور اب اس نے کھڑکی میں سے جھانکنا بھی بند کر دیا تھا۔ صرف کبھی کبھی سرک پر دونوں کی ٹڈ بھیسڑ ہو جاتی تھی۔ جو نرگس کے لیے چنداں خوشگوار نہیں تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں سر جھکائے چلا آ رہا ہوتا تھا۔ اسے دور سے آتا دیکھ کر نرگس اپنی راہ بدل لیتی تھی۔ وہ لڑکا کبھی راہ بدلنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ بلکہ اسی خود فراموشی کے عالم میں چلا آتا تھا قریب پہنچ کر وہ یونہی افسردگی سے نگاہ اٹھا کر نرگس کو دیکھ لیتا تھا اور پھر آگے چل دیتا تھا۔

اس سے زیادہ انھوں نے کبھی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا تھا۔ آج اتنی مدت بعد اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر نرگس کو دیکھا تھا اور پھر کوئی معرودہ سنانے کے لیے اسے وہیں ٹھہرنے کو کہا تھا۔ نرگس وہیں کھڑی رہی۔ اس نے وہاں سے ہٹنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ اتنے میں وہ لڑکا دوبارہ نمودار ہوا۔

مگر اب کے وہ ساتھ والی دیوار پر چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا۔ نرگس کو ایک دم غصہ آ گیا۔ کم بخت پھر محبت کی رام کہانی شروع کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہی بات تھی تو اسے ہاتھ سے کھڑا کرنے کے لیے کیوں کہا تھا۔

اس دوران میں اس کم گو بد صورت نوجوان نے لفافہ نرگس کی کوٹھی والے گھاس کے لان میں پھینکا اور خود نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

نرگس کو بڑا افسوس ہوا کہ اس نے خواجواہ وہاں رک کر اپنا وقت ضائع کیا۔ وقت ضائع

اڑدھوں کی طرح اس کی طرف منہ پھاڑے تک رہے تھے۔ نرگس سنائے میں آگئی۔ اس نے جلدی سے خط کو میز کی دراز میں بند کر دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔

یہ کیا سے کیا ہو گیا؟ یہ کہاں سے کہاں نکل آئے؟ ابھی تو آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی اور ابھی گہرے بادل گھر آئے؟ ابھی تو پھولوں پر شبنم مسکرا رہی تھی اور ابھی آگ کے تند و غضبناک شعلے کہاں سے بھڑک اٹھے؟ نرگس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میز کی دراز کھولی اور لفافہ نکال کر خط کو تیسری مرتبہ پڑھا۔

پھر وہی تحریر۔ پھر وہی الفاظ، پھر وہی آگ، پھر وہی شعلے..... نرگس بے تابانی اور انتہائی پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بھلا اسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو محمود اسے پہلے نہ بتا دیتا۔ وہ اپنی نرگس کو اندھیرے میں کیونکر رکھ سکتا ہے؟ نہیں اس نے جھوٹ لکھا ہے۔ یہ شخص خود کمینہ ہے اور محمود سے حسد کرتا ہے۔ اس نے محمود سے انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔

نرگس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ساتھ والی کونٹھی والی کھڑکی بند تھی۔ وہ غصے اور نفرت کے جوش میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ مگر..... مگر اس نے لکھا ہے۔

محمود کے ہوشل میں جا کر تم خود اس کی تحقیق کر سکتی ہو۔ تمہیں بتا ہی سے بچانا میرا فرض تھا۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب تم اپنے مستقبل کے بارے میں جو چاہو فیصلہ کرو۔

کرنے سے کہیں بڑھ کر اسے یہ افسوس تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ اس کے حکم کے تابع ہو گئی تھی اور محض اس کے اشارے پر وہاں کھڑی رہی تھی مگر اب کیا کیا جائے؟ اب کسی نہ کسی طرح اس لفافے کو اپنے قابو میں کرنا چاہئے۔ اس میں جو کچھ لکھا ہو گا وہ تو ظاہر ہے مگر اسے وہاں سے اٹھا لینا چاہیے۔ اگر کسی دوسرے کے ہاتھ آ گیا تو سارا بننا بکھیل بگڑ جائے گا۔

اس خیال کے ساتھ ہی نرگس کھڑکی سے ہٹ کر باہر باغ میں آگئی۔ کچھ دیر درختوں کے نیچے ٹہلنے کے بعد اس نے جھک کر نیلے رنگ کا لفافہ اٹھا لیا اور اسے لے کر اندر آگئی۔ کمرے میں آ کر اس نے اسے یوں میز پر رکھ دیا جیسے وہ مردہ چوبیا ہو۔ پہلے اس نے چاہا کہ وہ اسے بغیر پڑھے ہوئے ہی ضائع کر دے۔ ظاہر ہے اس میں یہی لکھ ہو گا کہ میں تم پر جان دیتا ہوں۔ تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ وغیرہ وغیرہ..... نرگس نے میز کی دراز سے دیا سلائی کی ڈبیا نکال کر اسے جلایا اور اس کے ننھے سے شعلے پر لفافے کا کونا رکھ دیا۔

ابھی لفافے کو آگ نہیں لگی تھی اُسے خیال آیا کہ خط پڑھ ہی لینا چاہئے۔ ذرا دلچسپی ہی رہے گی۔ چنانچہ اس خیال کے ساتھ اس نے دیا سلائی بجھادی لفافے کا کونا ذرا سا جل گیا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اندر سے چھوٹا سا نیلے رنگ کا پرزہ نکال لیا۔ یہ خط مختصر سا تھا اور صرف چھ سات سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

ایک بار پڑھنے کے بعد نرگس کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ دوبارہ پڑھ سکے

بہر حال اس نے ہمت کر کے بڑی بدحواسی میں خط کو دوبارہ پڑھا۔ اب کے بھی وہی الفاظ

لوں گی۔

اگر یہ سچ ہوا تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی خودکشی کروں گی تم بے فکر رہو۔ حوصلہ نہ ہارو اور میرے ساتھ چلو۔

اس کے بعد وہ دونوں کونٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر سڑک پر آگئیں۔ سڑک پر آتے ہی انھوں نے ایک خالی تانگہ لیا اور محمود کے ہوٹل کی طرف چل پڑیں۔ سارا راستہ دونوں خاموش رہیں۔ ان میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ دونوں کے ذہن میں خیالات کی وحشی اور خونخوار طوفانی موجیں چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔ نیلم کا ذہن زیادہ پریشان تھا۔ اگر یہ سچ ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے تو نہ صرف یہ کہ اپنی پیاری سہیلی سے دھوکا کیا تھا بلکہ اپنی زندگی کا تمام سرمایہ محمود کے قدموں پر نچا کر دیا تھا۔

تانگہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ہوٹل کے سامنے جا کر رک گیا۔ دونوں ایک ساتھ وہاں سے نیچے اتریں اور تانگے والے کو وہیں ٹھہرے رہنے کا کہہ کر خود ہوٹل کے گیٹ میں سے اندر عمارت میں داخل ہو گئیں۔ نرگس نے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کہا

مگر نیلی! وہ تو باہر گیا ہوا ہے۔

پھر کیا ہوا۔ ساتھ والے لوگ تو وہیں ہوں گے۔ ان سے ہمیں زیادہ معلومات مل سکیں گی۔ اچھا ہے کہ وہ خود یہاں نہیں ہے۔“

دوسری منزل پر جا کر نیلم نے دیکھا کہ محمود کا کمرہ بند تھا اور وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ والا کمرہ کھلا تھا۔ نیلم نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک دبے پتلے

اگر ایسی بات ہے تو وہ ابھی اس کے ہوٹل میں جائے گی۔ وہ ابھی اس جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ اتنے میں دروازے کا پردہ ایک طرف ہٹا اور نیلم اندر داخل ہوئی۔ وہ بڑی خوش تھی۔ اس کے ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا گلہستہ تھا۔ اس نے نرگس کا اڑا ہوا رنگ دیکھا تو سہم گئی۔

خیر تو ہے گلو؟

نرگس نے مردہ دلی سے خط کا ٹکڑا نیلم کے حوالے کر دیا۔ خط پڑھنے کے بعد نیلم کی بھی وہی حالت ہوئی جو نرگس کی تھی۔ اس نے خط کو دوسری مرتبہ پڑھا۔ پھولوں کا گلہستہ اس کے ہاتھوں سے نیچے فرش پر گر پڑا اور وہ نرگس کی طرف بڑھی۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس کمینہ فطرت انسان نے دوزندگیوں کو تباہ کرنے کی خطرناک سازش کی ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔

نیلم کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اور اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ نرگس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

لیکن اس نے تو کہا ہے کہ بے شک ہوٹل جا کر پتہ کر لو

اس کے ساتھ ہی نرگس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نیلم نے کہا

پھر کیا ہے۔ ہم ابھی ہوٹل جا کر اس کا پتہ کر لیں گی۔ یقین کرو وہاں جا کر یہی انکشاف ہو گا کہ یہ چپک رُومینہ شخص بکواسی ہے اور اس نے جو کچھ لکھا ہے حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ سب کچھ سچ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ میں کہیں کی نہ رہوں گی نیلی؟ میں خودکشی کر

میک پوش لوجوان نے دروازہ کھولا اور لڑکیوں کو اپنے سامنے دیکھ کر کسی قدر گھبراہٹ کے عالم میں

بولی

جی فرمائیے کس سے ملنا ہے آپ کو؟

نیلیم نے آگے بڑھ کر کہا

آپ کو پتہ ہے محمود صاحب کہاں ہوں گے؟

لڑکے نے میک اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور بولا

جی وہ پرسوں سے غائب ہیں دراصل وہ یہاں کبھی بکھاری آیا کرتے ہیں۔ مہینے میں دو

ایک بار یہ کمرہ بھر حال انھوں نے کرایہ پر لے رکھا ہے۔

نیلیم نے کہا

وہ میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں نا۔

اس لڑکے نے کہا

جہاں تک میرا خیال ہے وہ کسی کالج وغیرہ میں نہیں پڑھتے بلکہ انشوائس کہنی کا بزنس

کرتے ہیں۔ بہر حال آپ ایسا کریں۔ نمبر ۲۱۱ کے پاس جا کر معلوم کریں۔ وہ آپ کو زیادہ بہتر طرح

گائیڈ کر سکیں گے۔

”شکریہ“

کوئی بات نہیں

نیلیم اور زنگس کے رنگ فق ہو گئے۔ اب وہ کمرہ نمبر ۱۱۲ کے باہر تھیں۔ انھوں نے

دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے ایک لمبے قد کا مضبوط جسم والا لوجوان نمودار ہوا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بھی

گھبرا سا گیا۔

جی فرمائیے

نیلیم نے سوچا کہ یہاں ذرا ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس نے کہا

جی ہم راولپنڈی سے آئی ہیں۔ محمود صاحب سے ملنا تھا۔ ہم ان کی رشتہ دار ہیں۔

انھوں نے ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ یہاں نہیں ہے کیا آپ.....

لڑکے نے بات کاٹ کر کہا

جی ہاں محمود یہاں نہیں ہے۔ وہ تو کبھی کبھی یہاں آیا کرتا ہے۔ زیادہ تر گھر پر ہی رہتا ہے

یہ ہوٹل کا کمرہ تو اس نے یونہی شغل کے طور پر رکھا ہے۔ آپ اس کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔

زنگس اور نیلیم کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ ایک ایک بات ان کی توقع کے خلاف آج

ثابت ہو رہی تھی۔ نیلیم نے کہا

ہمیں گھر کا ایڈریس معلوم نہیں۔

اس کے بعد اس لڑکے نے اندر جا کر ایک پرچے پر محمود کے گھر کا ایڈریس لکھا۔ پرچہ نیلیم

کے حوالے کیا اور کہا

شاید وہ گھر پر نہ ہو، مگر بہر حال یہ اس کے گھر کا ہی پتہ ہے۔

اس کے بعد زنگس اور نیلیم دونوں خاموشی سے بیٹھیاں اتر کر واپس تانگے میں آکر بیٹھ

گئیں اور تانگہ شہر کے شمال مغربی دروازے کی طرف چل پڑا اس دروازے میں داخل ہونے کے

بعد تانگہ تھوڑی دور تک چلا رہا۔ پھر ایک گلی کے سامنے جا کر رک گیا۔

یہی گلی ہے بی بی جی

تانگے والے نے کہا

دونوں تانگے سے نیچے اتر پڑیں۔ انھوں نے تانگے والے کو رخصت کیا اور خود گلی کے اندر چل پڑیں۔ یہ گلی تو بڑے کھلی تھی۔ لیکن تھوڑی دور چل کر تنگ اور پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اب ان دونوں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ آخر ایک راہ گیر سے مکان کا نمبر دریافت کیا۔ انے دوسری بغلی گلی میں گھومنے کا اشارہ کیا۔ اور یہ دونوں محبت کی ماری روئیں بغلی گلی کی طرف اُتار دی گئیں۔

یہ گلی اس سے بھی زیادہ تنگ اور سرد تھی۔ یہاں دن کے وقت اندھیرا اور نمی تھی۔ آخر وہ منزل آ ہی گئی جس کی تلاش میں ان دونوں نے اپنا سکون تباہ کر رکھا تھا۔ ایک بڑے سے حویلی نما مکان کے گیٹ کے باہر نیلی تختی پر B/451 لکھا تھا۔ یہی وہ مکان تھا جس کا پتہ ہوٹل کے اس لڑکے نے دیا تھا۔

مکان کا بڑا دروازہ کھلا تھا اور اندر صحن دکھائی دے رہا تھا۔

زرگس اور نیلم دونوں گیٹ کے اندر داخل ہو گئیں اندر صحن میں جا کر انھیں کونے کی طرف سیڑھیاں دکھائی دیں پاس ہی گھنٹی بجانے والا بٹن بھی لگا تھا۔ نیلم نے کانپتے ہاتھوں سے گھنٹی بجائی۔

تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نیچے آئی۔

کس سے ملنا ہے بی بی جی؟

نیلم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

اوپر ذرا بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔

”آئیے“

اور وہ عورت انھیں اوپر ایک دیوان خانے میں لے گئی جس کے فرش پر گدے کا پرانا قالین بچھا تھا اور کانسے پر پھولدار صراحیاں پڑی تھیں۔ کمرے میں آرام کرسیاں اور صوفے بڑے قرینے سے سجائے ہوئے تھے۔ وہ دونوں دم بخود سی ہو کر بڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ابھی انھیں وہاں بیٹھے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ پردہ ہٹا اور اندر سے ایک خوبصورت شکل و صورت اور بھرے بھرے جسم والی عورت نمودار ہوئی جس نے بڑے قیمتی ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ زرگس کا دل دھک سے رہ گیا۔

یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہے؟ یہ کہیں وہ تو نہیں؟

عورت نے خندہ پیشانی سے نیلم کے سلام کا جواب دیا اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟ آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟

نیلم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

جی ہم یہیں لاہور سے آئی ہیں۔ ہمیں مسز..... اس عورت نے شرماتے ہوئے کہا

جی ہاں فرمائیے۔ میں ہی مسز محمود ہوں

زرگس کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دھڑکتے ہوئے ننھے سے دل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے کچل دیا ہو۔ اسے ایک دم ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ اور وہ نیم غشی کے عالم میں قالین پر گر پڑی۔ وہ عورت جلدی سے اٹھ بیٹھی

خیریت؟ کیا ان کی طبیعت خراب تھی؟

جی ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔ نیلم نے مردہ آواز میں کہا اور زرگس پر ہچک گئی۔

محمود کی بیوی نے فوراً خادمہ کو آواز دی۔

حشماں! جلدی سے گرم دودھ کا پیالہ لاؤ۔ جلدی

اور اسی شام کو ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔

نرگس اپنے ماتھے پر پٹی باندھے بستر میں پڑی تھی۔ اس کی امی اور ابا جان ابھی اس کی خبر لے کر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ نیلم اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سرد بارہی تھی اور کھڑکی بند تھی۔ بند کھڑکی کے باہر خزاں کی اُداس شام کو ویران بارش کی پھوار سبزے پر بڑی نرمی سے پڑ رہی تھی۔ جب کمرہ خالی رہ گیا تو اس نے غم آلود پلکیں نیلم کی طرف اٹھا کر کہا

”نیلی! میری ایک بات مانو گی“ نیلم نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے کہا
”کہو گئی“

یہ کھڑکی کھول دو

نیلم نے کھڑکی کھول دی۔ بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور کھڑکی کے پردے لہرانے لگے۔ نرگس نے پتک پر لیٹے لیٹے دیکھا کہ درختوں کی شاخیں بارش میں ٹپک رہی تھیں اور ان کی گنجان شاخوں میں خزاں نصیب ہو ادبی زبان میں غم زدہ محبتوں کے نوے دہر رہی تھی۔ نرگس نے تکیے میں منہ دے دیا اور بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ نیلم کا دل غم سے ڈوب رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس دریا کی طرح تھا جس کے کناروں پر ایک زبردست سیلاب کے گزر جانے پر گرے ہوئے درختوں کے تنے اور ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے شکستہ تختے ایک دگداز ویرانی کے عالم میں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوں۔



☆☆☆☆☆☆☆☆

اسے حمید کے دلچسپ ناول اور افسانے

کشمیر کے آتش فشاں

دہشت گرد جاسوس

جہاد مشن

ٹارگٹ سری نگر

کارگل کے شاہین

سیکریٹ ایجنٹ

ضرب مجاہد

یلغار مومن

سونا گاچی کی راتیں

بادل ڈکیت

دہن کا فرار

طوفانی رات میں فرار

جنگل جوگی اور لاش

سمندر میں دھماکہ